اشاعت مخصوص

سید غلام پنجتن

س، ۹۱۴
غ ل ا

سنہ ۱۳۵۳ف

مطبوعہ
عہد آفریں برقی پریس
حیدرآباد۔دکن

ملنے کا پتہ
حیدرآباد بک ڈپو
حیدرآباد۔دکن

SALAR JUNG ESTATE LIBRARY
(Oriental Section)
URDU PRINTED BOOKS:
Accession No. 7157 Cat. No.
Subject ... No.

علیگڈہ کی خصوصیات بہت ہیں۔ در اصل اون خصوصیات ہی کا نام "علیگڈہ" ہے!۔ لیکن اوسکی ایک ایسی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی شخص جس نے اپنی زندگی کے چند روز وہاں نہ گزارے ہوں سمجھ ہی نہیں سکتا کہ اس برادری کا۔ جس میں بھانت بھانت کے "جنور" شامل ہیں۔ حقیقی اساس ہے کیا۔ وہ روح جو عقدہ بن گئی ہے! پہلے تو اس نام ہی کو دیکھئے کہ وہ اپنے رسمی معنے سے بہت مختلف بولا جاتا ہے یعنی "علیگڈہ" سے مراد صوبجات متحدہ کا محض وہ شہر نہیں جس کا کھمبی یا بسکٹ اور تالے بہت مشہور ہیں۔ محض وہ مدرستہ العلوم نہیں جسکے بانی سر سید احمد خاں تھے۔ نہ وہ عبارت ہے اُس عظیم الشان یونیورسٹی سے جسکے کرتا دھرتا اب ڈاکٹر سر۔ یعنی ڈاکٹر سر ضیاءالدین ہیں!۔ ان سب سے علٰحدہ۔ ان سب سے بالاتر بھی ایک "علیگڈہ" ہے! وہ کوئی مادی جسم نہیں اور نہ اینٹ اور پتھر ہے بلکہ ایک زندہ روح ہے جو بوڑھے جسموں میں بھی اتنی ہی شگفتہ رہ سکتی ہے جتنی کہ جوانی کے گرم خون کیساتھ! باہر کا کوئی آدمی جب "علیگڈہ" کی اس روحانی برادری کی صحبتوں میں

جوانی اور بوڑھاپے کو یکجا پاتا ہے تو سمجھ نہیں سکتا کہ یہ محض تصنع ہے یا کوئی حقیقت حاضر ہے کہ جب علیگڈھ کا نام

درمیان میں آیا تو خیالات ۔ عقاید ۔ دولت ۔ عسرت ۔ علم و فضل اور مراتب و مناصب کے سارے امتیازات

اٹھ گئے ۔ ساری سطحیں برابر ہوگئیں ! ۔۔ یہ صرف علیگڈھ ہی کا معجزہ ہے ! بھائی "پنجو" کے لکھے ہوئے ان اوراق کو میں نے پڑھا تو

سب سے پہلے میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اے کاش ! پنجتن کیطرح علیگڈھ کے اور بہت سے کھلنڈرے بھی اپنی ایسی ہی

یادداشتیں مرتب کرا دیتے اور اون سب کو جمع کر کے ایک "تاریخ نفسیات علیگڈھ" مرتب ہو جاتی ! اس کتابچہ کا وہ

حصہ جو نثر میں گویا نظم کا دیباچہ ہے درحقیقت ان اوراق کا اصلی متن ہے ! اون نظموں کا جو علیگڈھ کے مخصوص

رنگ میں لکھی گئی ہیں پس منظر یہی نثر ہے ۔ یہ متن مختصر ہے مگر اوس علیگڈھ کا آئینہ ہے ۔۔ (ہمارا علیگڈھ تمہارا علیگڈھ)

جسکے آغوش میں عبداللہ اور علی حسن جیسے کھلاڑی مسعود ناہی اور سرفراز جیسے کھلنڈرے ۔ محمد علی اور شوکت علی

جیسے مردانِ میدان تصدق اور خواجہ جیسے سپاہی ۔ ذاکر جیسے صاحبانِ کردار اور پنجتن جیسے مخلص بے فکرے اور

منسوڑ پروان چڑھے ۔ یہ علیگڈھ کا معجزہ ہے کہ اوس ایک ہی سانچے میں ہر قسم کی شخصیت تکمیل پاتی ہے ۔۔ اور

اس قوس قزح کے سب رنگ پکے ہیں ! باوجود اختلاف طبایع اور امتیازات کم و بیش ان سب کو یکجا رکھئے تو ایک

سدا بہار گلدستہ بن جاتا ہے ! کہ اوسکے رنگوں کا اختلاف ہی بجائے خود اوسکی یک رنگی کا ضامن ہے ! اضداد کا

یہ اجتماع گویا خود ہی رد و ضداد ہے ! مثلاً ایک بات کہتا ہوں ۔۔ مجھ جیسے علیگڈھ کے بہت سے دیوانے ڈاکٹر ضیاءالدین کے

مسلک کو قبول نہیں کر سکتے اور ہمارے ڈاکٹر صاحب کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں لیکن جب علیگڈھ کے کھلنڈروں کی کسی صحبت میں ڈاکٹر صاحب اپنی تمام سیاسی سنجیدگی اور لیڈری کا بھاری پشتارہ لئے ہوئے داخل ہوتے ہیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ ہم میں سے نہیں ہیں یا ہم سے جدا ہیں — یہ بات کوئی کہہ ہی نہیں سکتا۔ ہم سب یقین رکھتے ہیں کہ سیاسی لیڈری کے اوس فلسفہ کی سطح کے نیچے جو ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا جزو بنگیا ہے "علیگڈھ" پھر بھی قائم و دائم ہے! "علیگڈھ کی اوس "روحانیت" کے دایرہ میں جو "علیگڈھ" نے ہمیں بخشی ہماری نظر کا بُرا بھی ہماری نظر میں بُرا نہیں ہو سکتا — اگر وہ "علیگڈھ" کا نام لیکر ہماری طرف آدے!

"پنجتن" کی طفلی اور جوانی نے علیگڈھ کی "گولڈن ایج" کا آخری دور دیکھا۔ اوس وقت سرسید کی روایات کے حامل محسن الملک اور وقار الملک تھے — وہ زمانہ علیگڈھ کی تحریک کے قرن اولی کا نصف آخر تھا! آج بھی جب کبھی علیگڈھ جاتا ہوں تو اوسکے در و دیوار پر محسن الملک اور وقار الملک کی روحوں کی پرچھائیاں دیکھتا ہوں! — اون پرچھائیوں کے دیکھنے والے میرے اور پنجتن کے بہت سے معاصرین ابھی زندہ ہیں۔ خدا کرے کہ یہ اوراق اون کو بھی اپنی یادداشتیں قلمبند کرنیکی ترغیب دیں!

ان اوراق کے مندرجات کے نسبت مجھے کچھ زیادہ کہنا نہیں۔ پنجتن جس انداز میں بولتے ہیں، اوسی انداز میں لکھتے بھی ہیں۔ نثر کی حد تک طرز ادا بے تکان اور دلچسپ ہے۔ نظم کی شوخیاں بھی وہی ہیں جو آج بھی

پنجتن کے بوڑھاپے میں اونکی جوانی کو جگاتی رہتی ہیں! خصوصاً اولڈ بوائز کے اجتماعات میں جہاں پنجتن کی نظم ہم سب کے بوڑھاپے کی خوش فعلیوں کا ایک نمایاں جزو ہوتی ہے ۔ اور کبھی یہ معجون فلک سیر محفل میں نہ ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ محفل آج خالی ہے!!

آج پنجو غزل سرانہ ہوا!

مزاح کی تعریف صرف یہ نہیں ہے کہ سُننے والے سُنکر ہنس دیں بلکہ صحیح تعریف یہ ہے کہنے والا سُننے والے کی جوانی ضرب سے بھی لطف اندوز ہونے کی اہلیت رکھتا ہو! مزاح کا تعلق عمر سے نہیں ہوتا، وہ سدا بہار ہے۔ وہ بوڑھوں کی زبان پر بھی جوان ہی رہتا ہے۔ علیگڈھ کی "مزاحیات" کا رنگ ساری دنیا سے نرالا ہے۔ لطیفے ہوں، فقرہ بازی ہو۔ حتیٰ کہ جھگڑا ہو۔ مگر علیگڈھ کی ہر بات عمومیت اور عام صحبتوں کے معمولات سے جدا ہوتی ہے۔ یہی اصلی اور مخصوص رنگ پنجتن کی نظم و نثر میں قائم رہتا ہے! اسلئے اونکی شاعری اور نثر نگاری اوس "علیگڈھیت" کا صحیح نمونہ ہے جسکو خود پنجتن نے اپنے ایک مصرع میں "تعلیم باطنی" کے نام سے موسوم کیا ہے! شاید اسی تعلیم باطنی کا یہ نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی جب سطح کے نیچے چھپے ہوئے خطرات پر نظر جاتی ہے تو اپنے علیگڈھ کی یہ محبت پنجتن کے قلم سے بھی خطرہ کی گھنٹی بجا دیتی ہے:-

سرفروشانِ علیگڈھ ہوشیار! مٹ نہ جائے وہ تمہارا نام و ننگ!

لاکھ پردوں میں ہو پوشیدہ مگر چھپتا نہیں چارہ سازانِ محبت سے کبھی دردِ نہاں
دل سے اپنے خواہشیں اغراض بیجا کی نکال ورنہ اس زنجیر کی کڑیوں کے کھل جائیں گے جوڑ

زندہ باد علیگڈھ!

محمد عبد الغفار

حیدرآباد دکن ۔ ۱۴؍ ستمبر ۴۴ء ۱۹

اللہ رسول کے فرمان کی تعمیل ہر مرد مومن کا ایمان ۔ دین و دنیا دونوں درست ۔
لیکن بیوی کے بھائی کے فرمودہ کی بجا آوری سے دل خوش ۔ گھر درست ۔ کان پیارے
تو بالے اور جورو پیاری تو سالے ۔ ذرا سے تصرف سے اس مثل کو اپنے پر اصل کیا
ہے ۔ پنجتن بھائی جان میری پسلی کی نکلی سیدہ بدر النسا بیگم کے بھائی جان اور میرے
بھی بھائی جان ۔ اپنے والد نواب سراج یار جنگ سے چاہے کچھ نہ پایا ہو ۔ لیکن
ذہانت ۔ متانت ۔ زندہ دلی اور شگفتگی تو پوری کی پوری میراث میں پائی ۔ میں سن
چودہ میں دارالعلوم علیگڈھ میں شریک ہوا ۔ جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی ۔ دانشگاہ
میں ہر طالب علم روز کے واقعات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا ۔ جدہر دیکھو ٹولیاں
بنی بیٹھی ہیں ۔ اور جنگ کی رفتار پر بحثیں ہو رہی ہیں ۔ خبروں پر رد و قدح ہو رہی
ہے ۔ میرا شمار جب بچوں میں تھا ۔ نیا نیا شریک ہوا تھا ۔ بڑوں کی باتیں خاموشی
اور ادب سے سنتا ۔ اس زمانہ میں طالب علموں کو خوردی بزرگی کا بڑا پاس لحاظ تھا

پنجتن بھائی جان کو اس وقت تو اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ میں ان کا بہنوئی بن بیٹھوں گا۔ اپنے ہم عصروں میں پیش پیش رہتے۔ خلافت کی تحریک بھی ترقی پر تھی مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا شوکت علی مرحوم بھی سیاست کے اکھاڑے میں اتر آئے تھے۔ اور زوروں پر حکومت سے کشتی ہو رہی تھی۔ لیکن ضابطہ کے ساتھ۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم بھی مسلمانوں کے محبوب بن چکے تھے۔ حسرت موہانی بھی دانشگاہ والوں کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔ غرض اس زمانے کی دانشگاہ میں مذہبی۔ سیاسی۔ معاشرتی موجیں اٹھ اٹھ کر ایک طوفان بپا کئے ہوئے تھیں۔ اور ہر طالب علم کسی نہ کسی لہر پر بڑا ہاتھ پاؤں مارتا چلا جاتا تھا۔ گھر سے زیادہ دانشگاہ پیاری تھی۔ اور رشتے داروں سے زیادہ عزیز دانشگاہ کے ساتھی۔ جو محبت وہاں ہو گئی۔ اس نے پھر دل کو خالی نہ چھوڑا۔ جس سے دل مل گیا۔ وہ ہمیشہ کے لئے دلدار بن گیا۔ وقت پڑے پر اپنے آنکھ چرائیں اور وہاں کے ساتھی؟ ہر طرح سے جان لڑائیں کام آئیں۔ پنجتن بھائی جان کا تخلص بھی اسی زمانے کی دوستی کی یادگار ہے۔ چاہے برسوں ملنا نہ ہوتا ہو لیکن جہاں مشاعروں میں اپنا تخلص قمری آسا شمشاد لائیں گے۔ دوست کی یاد تازہ کرا دیگا۔ انکو علیگڈھ سے اور علیگڈھ والوں سے عشق ہے۔ ترانہ اور علیگڑھ یہ دونوں نظمیں اس کا ثبوت ہیں۔ کرکٹ کلب والی نظم میں

مختصر با معنیٰ علیگڑھ میں گیند بلے کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ اکثر نظمیں ٹیپو کے لڑکوں پر ہیں۔ نواب فخر یار جنگ بہادر۔ نواب عسکر یار جنگ بہادر۔ نواب صاحب چھتاری۔ غلام محمد صاحب۔ حسن محمد حیات۔ سر محمد یعقوب۔ اور سعید الرحمٰن قدوائی پر مستقل نظمیں ہیں۔ غلام محمد والی نظم میں اپنی فارسی دانی بھی دکھا گئے ہیں۔ سعید الرحمٰن قدوائی کا اس مجموعے میں اس قدر ذکر آیا ہے کہ شک ہونے لگتا ہے۔ اس مجموعے کی زیادہ نظمیں بڑے لڑکوں کی محفل حیدر آباد سے متعلق ہیں۔ جو اس کے جلسوں میں پڑھی گئیں۔ ان میں بہت سے دوستوں کے نام اور انکے پر لطف خصوصیات کا اشارتاً کنایتاً ذکر ہو گیا ہے۔ چند رباعیاں ہیں۔ ایک بڑے عزیز کا سہرا لکھ کر خاکہ اڑایا ہے۔ گیارہ غزلیں ہیں۔ دس بن تخلص کی۔ آخر گیارہویں غزل میں تخلص نہ چھپا سکے۔ اس مجموعے میں جو کچھ ہے وہ رسمی ہے۔ لیکن بھائی جان ہزل اور مزاحیات کے بادشاہ ہیں۔ میرے علم میں اسوقت ان سے بڑھ کر اس صنف میں کوئی نہیں۔ اپنے متقدمین پر جو انکو فوقیت ہے۔ وہ الفاظ کی شوکت اور بندش کی چستی اور اس پر سہل الممتنع۔ اکثر دوستوں کی شادیوں پر مسدس لکھے ہیں۔ خوب لکھے۔ عظمت اللہ صاحب مرحوم برادر نواب رحمت یار جنگ۔ عباس حسین مرحوم عزیز نواب سالار جنگ بہادر

اور ممتاز الحق کی شادی کے مسدس نقل مخفل ہونے کے علاوہ پوری پوری ادبی شان
رکھتے ہیں ۔ میری بھی شادی پر نظم کہی ہے ۔ اگر چھپوا دیتے تو مجھے تو کوئی اعتراض
نہ ہوتا ۔ جبکہ اس نسخے کی تشہیر اور اشاعت بصیغہ راز خاص حلقے تک محدود ہے ۔
بھائی جان کا یہ فقرہ علیگڈہ کیا ہے ؟ میں ہی تو ہوں ۔ سونے کے پانی سے
لکھنے کے قابل ہے ۔ اور اس لائق ہے کہ ہر ایک فرزند دانشگاہ اسکو حرز
جان بنالے ۔ دانشگاہ کے جو حالات لکھے وہ بڑی والہانہ طرز میں لکھے ہیں ۔
شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے جی نہیں مانتا ۔ زبان میں وہ شوخی ہے
جو اس گھرانے کی تحریروں میں طرہ امتیاز ہے ۔ اس کی زبان محسن الملک کی
آیات بنات اور سید امیر حسن صاحب کی آیات محکمات کے بین بین ہے ۔
دونوں کا رس نکال کر اپنی خوش سلیقگی سے بانکی ترکیب سے شربت تیار
کیا ہے ۔ کہ ایک ایک فقرہ مزیدار گھونٹ ہے ۔ کیف آور ۔ کہ پئے جاؤ
اور مزے کرو ۔ خمار کے خوف سے نڈر رہو طالب علمی کی مستانہ زندگی بسر
کرنے لگو ۔ اب سے بیس پچیس کیا بلکہ تیس چالیس برس پہلے کی علیگڈھی دنیا
آنکھوں کے سامنے رنگ برنگی طلسمی لباسوں میں آموجود ہو ۔ وہاں کی شوخیاں ۔
مردہ دلوں کو زندہ اور بھولے ہوؤں کی یاد تازہ کر دیتی ہیں ۔ آپ دانشگاہ کی

سیاست سے ایسے واقف ہوجاتے ہیں کہ دماغ پر بار نہ پڑے اور سارے
واقعات بےکم وکاست آپ پر منکشف ہوجائیں۔ اور آپ مطالعہ کے دوران
میں بیوی سے بے نیاز بچوں سے بے خبر دنیا کے بندھنوں سے آزاد وہی
الل بچھیرے بن جاتے ہیں۔ جب آنکھ کھلتی ہے تو کلیجے پر گھونسا سا لگتا ہے۔
کاش وہ دن واپس آجائیں۔ اور ہم ویسے ہی بےفکرے ہوجائیں۔ مجھے بھائی جان
کی وہ صورت یاد آگئی جو اب سے پچیس برس پہلے تھی۔ دبلے پتلے چھریرے سے۔
کھلا ہوا گیہواں رنگ۔ بڑی بڑی تیز اور ذہین آنکھیں۔ آنکھ کی مناسبت سے
ناک۔ زبان میں ذرا لکنت۔ یہ نہ ہوتی تو غضب کرتے۔ محفل میں کسی کو بولنے
کا موقعہ ہی نہ ملتا۔ سنگارڈی کے ریشم کی شربتی رنگ کی شیروانی۔ لاکھوں کمائے
اور کھائے اڑائے۔ جوڑنا نہ جانا۔ یہ لکھ لٹ پنے کی وصف اپنی والدہ سے
جو عباسیہ خاندان کی ہیں اور لکھ پتی باپ کی بیٹی ہیں پائی۔ چھوڑ پن باوا سے
پایا۔ رہی ذہانت وہ تو خاندانی میراث ہی ہے۔ دوستوں کے پیچھے دیوانے
ہیں اور میری طرح مزے کے پیچھے بھانڈ۔ بیوی بھی گڑیا ملی ہیں۔ جو قدامت
شرافت کے ساتھ ساتھ جدت کو بھی لئے رہتی ہیں۔ بیٹی باپ کے نقش قدم پر
ہیں بلکہ علم میں بڑھی ہوئی کہ عثمانیہ کلیہ اناث میں معاشیات کی پروفیسر ہیں۔

بچے بیٹے ذکاوت میں باپ سے بھی آگے معلوم ہوتے ہیں۔ مقرر بھی ہیں۔
مضمون نگار بھی ہیں۔ اور سلجھی ہوئی طبیعتوں کے مالک۔ ان کو گھر میں بیوی بچوں
میں گھرا دیکھنا ایک عجیب لطف ہے۔ اور مزا تو جب آتا ہے کہ بیگم صاحب
کو غصہ کسی بچے پر آجائے۔ اور وہ مارنے کو اٹھیں۔ اور بھائی جان کو ممتا
کا جوش اُٹھے اور بیچ میں بچے کو بچانے کے لئے آجائیں۔ اور آجائیں چپیٹ
میں۔ پھر جو فیل مچاتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ ہنستے ہنستے دوسروں کے پیٹ میں
بل پڑجائیں۔ اور وہ بیگم سیدانی۔ پریشان ہوجائیں کہ اچھے فیلہائے مردود
سے سابقہ پڑا ہے۔ جس قدر یہ اڑاؤ ہیں اتنی ہی بیگم صاحب منتظم۔ اسلئے
عزت سے بنی ہوئی ہے۔ اور خوش گزران ہوئے چلی جاتی ہے۔ انکے
پاس جب چلے جاؤ۔ خوش ہوکر آؤ۔ غم غلط ہوجاتا ہے۔ شاید آپ
صاحبوں کو یہ نہ معلوم ہو کہ گھر میں نماز و وظیفے کا شوق قدیم سے ہے۔ جوانی
کے ڈھلاؤ سے نہیں پیدا ہوا۔ ہر صحبت میں اپنے کو ایسا بنا لیتے ہیں کہ
گویا اسی صحبت کے لئے بنائے گئے ہیں۔ صرف دوستی اور محبت سے
ہی مرعوب ہونا جانتے ہیں۔ کسی اور طرح کی دھونس ان پر جمنی مشکل ہے۔
ایک اچھا خوبصورت گھر اور باغیچہ بنا لیا ہے۔ نجد نام ہے۔ وہ دوستوں کی

دعوتوں کے لئے ہے۔ خود کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔ گھر میں ان کی والدہ تمام کنبے کو سمیٹے بیٹھی ہیں۔ اور بیگم صاحب سب کی ضروریات کی سربراہی میں مصروف نظر آتی ہیں۔ ساس بہو ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ ماں بیٹی ہیں۔

بیگم سراج یار جنگ بھائی جان پنجتن کی والدہ محترمہ ظہور علی صاحب مرحوم دیوان ٹونک، کی پوتی ہیں۔ پنجتن بھائی کے ماشاء اللہ سات بچے ہیں۔ بھابی جان اگر ایک اور بیٹیا جن لیں تو بڑوں کی دعا ست پوتی پوری ہو جائے۔ بڑی سب میں تصدق فاطمہ بیگم سلمہا ہیں۔ اور بھائی سب ان سے چھوٹے ہیں۔ سید ریاض الحسن سید صفدر حسن۔ سید عابد حسن۔ سید تراب حسن۔ سید ارشا حسن سید عسکری حسن سلمہم اللہ تعالیٰ۔

جب بھائی جان کے پہلوٹی کی لڑکی پیدا ہوئی اس کا نام تصدق فاطمہ رکھا۔ بھائی جان نے تاریخ ولادت کہی۔ مزاح کے پھلو کو ہاتھ سے نہ دیا۔

ملاحظہ ہو فرماتے ہیں :—

تصدق فاطمہ تو اس وجہ سے نام رکھا تھا
کہ ہو حب علی۔ آلِ محمد سے محبت ہو
ہوئی تاریخ کی جب فکر تو جورو نے فرمایا
میں سچ کہتی ہوں صاحب جو تصدق خوبصورت ہو

بھابی جان پنجتن بھائی جان کو مخاطب بھی صاحب کہہ کر کرتی ہیں۔ بھائی جان کی شوخی ملاحظہ ہو کہ شریک زندگی کو سروش غیبی بنا دیا۔

آغا حیدر حسن مرزا
نظام کالج
حیدرآباد
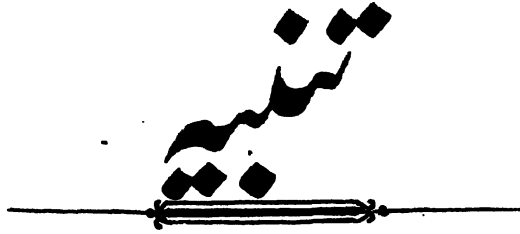
مقصد پرانی صحبتوں کی یاد تازہ کرنا ہے اس کتاب کی

تشہیر اشاعت بصیغہ راز خاص حلقہ تک محدود ہے۔

دروغ بہ گردن راوی سنا ہے کہ ایک صاحب شانِ خودداری

کی زد میں تبسم زیر لب سے بھی محروم ہو چکے ہیں ممکن ہے کہ

وہ ہنس دیں۔

فرانس کا بادشاہ لوئی چہاردہم کہا کرتا تھا

THE STATE — IT IS I

میرے لئے بھی یہ کہنا کچھ نازیبا نہ ہوگا کہ علیگڑھ کیا ہے میں ہی تو ہوں۔
ف۔ بقول شخصے کہ نکتہ چین کی زبان کس نے بند کی ہے اور کہنے والے کا منہ کس نے بند کیا ہے اور مارنے والے کا ہاتھ کس نے پکڑا ہے اسلئے اس دعوی کے ساتھ یہ بھی صاف کردوں کہ علیگڑھ سے میری مراد ممالک مغربی و شمالی کا جس کو آپ یو۔پی کہتے ہیں وہ ضلع نہیں ہے جو میرٹھ کی قسمت سے نکال کر آگرے کی کمشنری میں ڈالدیا گیا ہے اور اب پاکستان کی بھینٹ چڑھنے والا ہے اور نہ وہ یونیورسٹی ہے جس پر اظہار خیالات کرنے کیلئے اور ایڈیٹری کے فرائض انجام دینے کے لئے قاضی عبدالغفار صاحب کو ایک مستقل عنوان۔

"یہ علی گڑھ ہے"

ہاتھ آگیا ہے علیگڑھ سے میری مراد وہ کالج و اسکول ہے جسکو ایم۔ اے۔ او کالج کے نام سے سرآنکھوں پر رکھتے تھے یعنے وہ پودا جس کو سرسید نے اپنے ہاتھ سے لگایا نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک ایسی ہستیوں نے اپنے خون سے سینچا۔ سر انٹونی میکڈانل کے حملے جھیلے۔ سر جان ہیوٹ کی چوٹیں سہیں اور سر جیمس میسٹن کے نشتر غمزے دیکھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے گھر اور سرسید کے مشن کا کچھ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے عجب نہیں کہ میری پیدائش کے وقت اوّل ان کی آواز میرے کان میں پڑنے کے بعد اسم احمد پڑا ہو۔ سرسید کی دوستی کی بدولت ہمارے خاندان ہی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ نواب محسن الملک مرحوم کے اکلوتے اور جوان بیٹے کی لاش گھر میں آئی اور پیچ کریت خوتی دیگر شہر کے مسلمانوں نے سر ایک سید کے جنازے

کی شرکت سے باز ہی نہیں رکھا جاتا بلکہ سقوں کو پانی بھرنے اور مہتروں کو کمانے سے روکا گیا۔ شیعہ علماء کو تو یہ غصہ تھا کہ آیات بینات ایسی کتاب اس گھر سے نکلی اور سنی علماء اس پر تلے ہوئے تھے کہ۔ یہ وقت ہے نیچریت سے توبہ کرانے کا۔ علیگڑھ کی آمد و رفت تو سر سید مرحوم کی زندگی سے شروع ہو گئی تھی لیکن طالب علمی کا مرتبہ رجسٹر میں نام لکھا کر سنہ ۱۹۰۱ء میں حاصل ہوا۔ اگر ہیچ مدانی کی پارینہ رسم ترک کر دوں تو ۱۹۰۵ء سے لیکر ۱۹۱۶ء تک کی میں اپنے آپ کو علیگڑھ کی زندہ تاریخ کہہ سکتا ہوں جس سے کسی صاحب کو اختلاف کرنے کی وجہ نہ ہوگی اور زندہ تاریخ بھی کیسی ظاہری اور باطنی دونوں ابھی زندہ ہیں۔ مولانا طفیل احمد صاحب اور البشیر دونوں سے تصدیق کر لیجئے۔

ف ۔ ارادہ تھا کہ جیسے لارڈ کرزن نے دو جلدیں ہندوستان میں برطانوی نظم و نسق پر لکھی تھیں اس مشہور و معروف کتاب کی طرز پر میں بھی "کمرہ نمبر تیرہ" کی تاریخ لکھ ڈالوں دیکھنے میں تو وہ کتاب کرکٹ کلب سے متعلق ہو لیکن کالج کی دوسری دلچسپیوں سے اسطرح کڑی سے کڑی ملتی چلی جائے کہ اسیں کالج کی زندگی کی پوری کیفیت آجائے وہ آرزو ابتک پوری نہیں ہوئی۔ اگر فلک کج رفتار کبھی ایسی چال چلگیا کہ میرا اور حسن محمد حیات صاحب کا جھینپ پندرہ روز کو پھر ساتھ ہو گیا تو دنیائے ادب میں وقائع نگاری کا وہ نمونہ پیش کیا جائے گا جو آئینہ دار حقیقت و مجاز ہو گا۔

کیونکہ اسکورنگ کار طفلاں نیست اور ایمپائری۔ ڈکٹیٹر شپ سے کسی طرح کم نہیں۔

اب یہ اصرار ہو رہا ہے کہ میں اپنی چند نظمیں جو خاص علیگڑھ کے رنگ میں ہیں اور علیگڑھ ہی برادری میں پڑھی گئیں ہیں شایع کردوں اور چند صفحوں میں علیگڑھ کے بورڈنگ لائف کا وہ رُخ بیان کردوں جو علیگڑھ کا پایہ امتیاز اور دنیا سے نرالا ہے جو بادی النظر میں تفنن طبع و تفریح تک محدود ہے مگر لامحدود نتایج پیدا کرتا ہے جو اس زندگی سے مستفید ہو کر ہی حاصل ہو سکتے ہیں اور کرکیٹر سازی اور کار کردگی کا ممد و معاون ہو کر کبھی لایق کو نالایق کبھی جاہل کو عاقل کبھی ست کو چست عاقل کو ہشیار بنا کر اسفل سے اعلیٰ پر پہونچانے میں جرِ ثقیل کا کام دیتے ہیں اچھا تو اب ذرا ترقی معکوس رہے اور اقبال کی زبان میں حکم دیجیے کہ۔

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

تا آنکہ کلکتہ میں لارڈ کرزن اور علیگڑھ میں مسٹر ماریسن اپنی اپنی قوتوں کے ساتھ برسر حکومت نظر آنے لگیں پکی پارک صرف وکٹوریہ گیٹ تک پہونچی ہو اور سامنے اسٹریچی ہال اسطرح نظر آئے کہ ایک عربی اونٹ معہ کجاوہ بیٹھا ہے اور ادہر ادہر کی سب عمارتیں سوائے مہدی منزل کے غائب ہیں پھاٹک دن رات بند صرف کھڑکی کھلی ہوئی اس سے آمد و رفت اور اس سے لگی ہوئی لنگڑے خان کی چارپائی۔ پھاٹک سے ملا ہوا دواخانہ ایک کمرے میں میز پڑی ہوئی اور کرسی پر ڈاکٹر شفاعت اللہ خانصاحب

مرحوم اور انکے پاس ایک طویل القامت کمپونڈر عظیم الدین بیٹھے ہوئے قوم مرحوم کے نونہالوں میں سے کسی کی سوجھی کلائی پر آئیوڈین لگا رہے ہیں اور کسی کے پھٹے انگوٹھے میں آنڈ و فارم بھرتے ہوئے اذان کا انتظار کر رہے ہیں۔ بس اب پہونچ گئے آپ بیسویں صدی کے شروع میں اور شروع ہوتا ہے یہاں سے فاسٹ وارڈ مارچ۔

بپن چندر پال کی تقریروں سے کرزن نالاں اور انگلستان پلٹ مسلمانوں سے مارسین پریشان مطالبہ ہوتا ہے کہ کلب میں کو جلسوں میں انگریز پروفیسروں کے دوش بدوش اسٹریچی ہال میں ڈائس پر بیٹھاؤ۔ ہندوستان بھر میں نیچری ارگن لے دے کے دو ایک علیگڑھ انسٹیوٹ گزٹ جس پر سلیم قابض دوسرے اٹاوے کا البشیر۔ نواب محسن الملک بہادر کو دنیائے اسلام کی ترقی کا مدار مارسین صاحب کی نگاہ لطف میں نظر آئے اور مارسین صاحب کی چال ان دونوں کو نہ بھائے باطنی حالت یوں ناموزوں اور ظاہری حالت کمی سرمایہ و خسارہ رقم کی وجہ سے زبوں بھاگا بھاگ چندے کی مہم جاری تھی اور سفر پر سفر ہو رہے تھے اٹاوہ محسن الملک کا وطن تھا آتے جاتے دو ایک روز کو اپنے بڑے بھائی کے پاس ٹھیر جاتے تھے اور لوگ سمجھتے تھے کہ وے آئے البشیر کو کہنی۔ اس مرتبہ جو آئے تو انکی چھوٹی بھاوج ہادی حسن صاحب کی (جو آجکل علی گڑھ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں) والدہ اٹاوہ میں موجود تھیں۔

وہ مصر ہوگئیں کہ مجھکو اٹاوے سے ہٹا لیا جاوے غرضکہ دوسرے دن شام کو اٹاوے سے روانہ
ہوکر قوم کا یہ سعد قدم خادم بیگ بینی و دو گوش علیگڑھ پہونچا ۱۹۱۰ء کو دیکھی اور ۱۹۱۶ء کو
اس عرصہ میں علیگڑھ کہاں سے کہاں پہونچا۔

نواب صاحب مرحوم اس زمانے میں نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب مرحوم کی بیلی کوٹھی
میں آ چکے تھے اسکے وسیع ہال میں بیگم صاحب رہتی تھیں اور اگر کوئی باہر والا کھانے پر مدعو ہو تو
نواب صاحب بھی اسی کمرے میں دونوں وقت کا کھانا کھاتے تھے اور اسی کمرے میں رات کو
مرزا بشیر بیگ (نواب بشیر یار جنگ بہادر) سوتے تھے اس رات کو ایک پلنگ میرے لئے
بھی اسی کمرے میں اور پڑ گیا۔ بشیر بیگ نواب صاحب کے سالے مرزا قادر بیگ کے بڑے
فرزند نواب نذیر جنگ بہادر کے فرزند تھے اور میرے دادا نواب صاحب مرحوم کے
چچازاد بھائی ہونے کے علاوہ بہنوئی بھی تھے۔ ان دونوں میں بڑی دوستی تھی دونوں عین جوانی
میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ بیگم صاحبہ مرحومہ میرے والد نواب سراج یار جنگ بہادر
اور نواب نذیر جنگ بہادر سے محبت کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے بشیر اور میں بھی ہمیشہ انکی محبت سے
مستفید ہوتے رہے۔ ہم دونوں کے اسطرح پلنگ ایک جگہ دیکھکر دادی اماں کو
حیدرآباد کا زمانہ یاد آگیا جب ہم دونوں کے والد اسی طرح انکے کمرے میں رہتے تھے

اور میاں بی بی نے حیدر آباد کی پرشکوہ آرام و آسائش کے قصے شروع کر دئے۔ بیگم محسن الملک
عربی و فارسی میں خاص مہارت رکھنے کے علاوہ انگریزی پر بھی قادر تھیں مگر پردے کی سخت
پابند تھیں نہ کبھی کوئی مضمون لکھا نہ کبھی کسی جلسہ میں شریک ہوئیں انکی اس کمی کو انکی چھوٹی بھاوج
مسز امیر حسن نے پورا کیا جنہوں نے ایک طرف تو نواب عماد الملک بہادر کی دختر نیک اختر
کی ہمنوا ہوکر تعلیم نسواں کا پرچار کیا اور پھر ضعیف العمری میں کھادی پہن کر ملکی صنعت کی ترقی
و ترویج میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا۔ بیگم محسن الملک کو صحت کے ساتھ الفاظ بولنے
کی بڑی عادت تھی ہم لوگوں کو تو زیر زبر پیش بتا کر فوراً تلفظ یاد کرا دیتی تھیں مزا اسوقت
آتا تھا جب نواب صاحب کوئی انگریزی لفظ بول جائیں بیگم صاحب اسوقت تو خاموش
ہو جاتیں منٹ دو منٹ بعد وہی لفظ فوراً استعمال کرتیں اور نواب صاحب جی بیگم صاحب
کھکر وہی لفظ دہرا دیتے۔ اس وقت ہم بچے مسرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتے۔ ہنسنے
یا بات کرنے کی کسکی مجال تھی اب نہ وہ لحاظ و محبت ہے اور نہ وہ شفقت و خوف نئی
تہذیب ہے اور اسکے نئے ضابطے رہے نام اللہ کا نہ کوئی رہا ہے اور نہ کوئی رہے گا۔
رات کو نیند بھر کر سوئے مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کل کا دن میری زندگی میں کس قدر
اہم ہوگا صبح بیگم صاحب نے عبدالرحمن کو پکارا عبدالرحمن ہی ایک چھوکرا تھا جو بیگم صاحب کے

کمرے میں آتا جاتا تھا اور نہ ہمارے یہاں کے کوئی پرانے ملازم تک زنانے میں نہیں آسکتے
تھے۔ اور اس سے کہا کہ بچوں کو اٹھاؤ بشیر کو تو عادت پڑی ہوئی تھی وہ اُٹھا اور اُٹھکر
آداب بجا لایا اور میرا لحاف گھسیٹ لیا یہ پہلی بدعنوانی تھی جو میں نے دیکھی تھی مگر کیا کرتا
خاموش رہگیا بشیر مجھکو پکڑ کر ایک دوسرے کمرے میں لے گیا اور عثمان ماموں جان
کے پلنگ پر عمو جان کہتا ہوا گرا وہ اُٹھے اور اس نے مجھسے کہا کہ یہاں جتبک چاہو
سوتے رہو۔ محمد عثمان صاحب نواب صاحب کی والدہ محترمہ کے قریب کے رشتہ دار تھے
سرسید مرحوم کی وفات پر انہوں نے ایک پرجوش اور رقت آمیز مرثیہ لکھا تھا
نواب صاحب اسکو اکثر سنا کرتے تھے صاحب موصوف انکے ساتھ رہتے اور انکے
دفتر میں کام کرتے تھے۔ اور علیگڑھ والوں میں گھل ملکر نئے پرانے ہو چکے تھے میرے
رشتہ کے ماموں تھے اور کلکٹر کے خطاب سے سرفراز تھے خان بہادر سید
زین الدین صاحب مرحوم نے انہیں کے شان میں فرمایا تھا۔

مولوی کلکٹر غریب مدرسہ والاں میں
اینٹھتے پھرتے تھے یوں جیسے کہ جنگل میں سانڈ

گردش افلاک کے انکے چکر میں وہ
پھبتیاں کہنے لگے بن کے محرر سے بھانڈ

آمدم برسر مطلب ابھی ناشتہ بھی جی بھر کر نہ کیا تھا کہ طلبی ہوئی اور ہم نواب صاحب کے

بیڈروم میں بلوائے گئے انکے لکھنے پڑھنے کی میز بھی اوسی کمرے میں رہتی تھی نواب صاحب مسہری پر کمبل اوڑھے بیٹھے ہیں اور مسہری سے لگی ہوئی آرام کرسی پر ایک دبلے پتلے بزرگ خضر صورت ریش دراز پرانے وضع کی ترکی ٹوپی بر سر پلیس فور پہنے بیٹھے ہیں یہ بزرگ نواب صاحب کیا بلکہ سر سید کے مخصوص بے تکلف دوستوں میں سے تھے مولوی سید زین العابدین صاحب مرحوم - یہ بزرگ سید کی محبت میں اپنا گھر بار سب بیچکر علیگڑھ میں آ جمے اور تینوں مر کر بھی نہ چھوٹے ایک ہی جگہ دفن ہوئے سر سید کے پہلو میں ابدی نیند سونا نصیب ہوا - انہوں نے مجھے محبت سے پیار کیا اور اپنے پیروں کے پاس کرسی پر بٹھا کر دلاسا دیا اپنے بیٹے نور الدین سے دوستی کرا دینے کا وعدہ کیا صاحب موصوف کو بچوں سے باتیں کرنیکا خاص ملکہ تھا دو چار منٹ ایسی لطف سے انہوں نے باتیں کیں کہ میں اٹھا وہ چھوٹنے کا سب غم بھول گیا - اسکے بعد ہم رخصت کرئے گئے اور وہ دونوں پاک ہستیاں معلوم کبتک بیٹھے رہے سنا تھا کہ سر سید انکو زینو اور محسن الملک کو مہدی کہکر مخاطب کیا کرتے تھے پرائیوٹ صحبتیں کبھی انکی بند نہیں ہوئیں اور پبلک اختلاف مدت العمر نہیں ہوا - وہیں میں معلوم ہوا کہ میری قسمت کا فیصلہ انکے مشورے سے یہ ہوا کہ نہ تو مجھے انگلش ہوس میں جو اسی ہفتے بروں صاحب کی زیر نگرانی قایم ہوا تھا رکھا جاوے نہ بشیر اور چچا محمود بیگ صاحب کی طرح بنگلے پر بلکہ ڈ بنچر میں جو بعد کو ماریس کورٹ کے نام سے موسوم ہوا - نواب حسن کے ساتھ رکھا جائے ١٩١٥ء میں انہیں کی پھوپی زاد بہن کو ہماری رفیقہ حیات بننے کا شرف حاصل ہوا یا اس رشتہ مناکحت سے ہماری دین دنیا سنبھل گئی ہماری زندگی کا ہا ایک ایسا اہم مسئلہ ہے کہ ٢٩ برس گزر جانے پر بھی ہم دونوں ایسے متفق نہ ہو سکے کہ

اونھیں شرف حاصل ہوا یا ہماری عاقبت سنبھل گئی۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ کتنی شوہر پرست تہذیب جدید سے نابلد۔

مسٹر مارلیسن شام کو نواب صاحب سے ملنے آینوالے تھے اور ہمکو تیار رکھنے کا بشیر کو حکم مل چکا تھا اودہر مارلیسن کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہوںگے کہ اس ڈور میں نواب صاحب کیا کر کے آئے اودہر ہم حواس باختہ کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے اس سب پر المضاعف یہ کہ بشیر رہ رہ کر بگڑ رہے ہیں کہ کوئی کپڑا اس قابل نہیں جسکو پہن کر مارلیسن صاحب کے سامنے جائیں انگریزی کپڑوں میں صرف دو سفید پتلوں اور ایک کالا کوٹ آخر کو شہر سے کار منگا یا گیا پتلوں کوٹ پر استری ہوئی اور بشیر اپنی الماری میں سے ٹائی رومال اور پتیا بہ نکال کر لائے۔ ہماری تو جان بر بنی ہے اور انہیں خاندانی وقار کی پڑی ہے الحاصل سوٹ پہن اور ٹیڑہی مانگ نکال ہم محمود بیگ صاحب کے کمرے کے سامنے ہیں نورالدین اور داؤد ہمارے پاس اور ضیاءالدین صاحب مرحوم عین الدین صاحب (خان بہادر سید عین الدین دیوان دتیا) محمود بیگ صاحب کے کمرے سے ہمارا تماشہ دیکھہ رہے ہیں کبھی میرے دل میں یہہ خیال آتا ہے کہ میں بنایا جارہا ہوں اور کبھی کچھہ۔ اس اثناء میں آپہونچے مسٹر مارلیسن پرنسپل نواب

محسن الملک کے بنگلے پر سناٹا ہے کہ ہر طرف چھایا ہوا ہے۔ نواب صاحب کا ملازم
خاص کلن اور اسکا بھائی محبوب سفید صاف کپڑے پہنے صافہ باندہے اوہر سے اُدہر
بھاگ رہے ہیں جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ہمارے چہرے پر ہوائیاں اڑتی
جاتی ہیں ہمارے اس مصیبت کا زمانہ ختم ہوا اور کلن آکر ہمیں ڈرائینگ روم کی طرف
لے چلا اوسکا میرے کندہے پر ہاتہ رکھنا تھا کہ شیر اُدہر سے گرجا کلن کا ہاتہ ہٹاکر
کہا کہ ہندوستانیوں کی طرح مت لیجاؤ۔ اسپر جو لوگ وہاں تھے ہنس دیئے اور مجھکو
پورا یقین ہوگیا کہ میں بنایا جا رہا ہوں قصہ کوتاہ میں نہایت بدحواسی کی حالت میں
کمرے میں داخل ہوا مارسین صاحب ٹانگیں سیدہی کئے سوفے کی ایک طرف اور اسی
سوفے کی دوسری کونے پر نواب صاحب داڑہی پر برش کئے ترکی ٹوپی لگائے
کوٹ پتلون پہنے (کوٹ بند گلے کا) تشریف فرما تھے میں نے سلام کیا نواب صاحب
نے فرمایا یہہ میرا پوتا ہے سراج کا بچہ آپکے لئے لے آیا اُنہوں نے کہا

YES YES I KNOW DR. SIRAJ

نواب صاحب نے گردن ہلائی مجھے نہ معلوم مارسین صاحب نے کیا انگریزی
میں کہا بوکھلاہٹ میں میرے منہ سے نکلا۔ I AM A NATURY

ہنستے ہوئے انہوں نے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور مجھے اپنی طرف کھینچ کر
پیار کیا میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا فاتحانہ خوشی مجھے اسوقت ہوئی اور اس دن سے
کچھ ایسا اثر میرے دل پر پڑا کہ مجھے مارین صاحب کی برائی سننا کبھی نہ بھایا اور کبھی
انکی مخالفت میں عملی حصہ نہیں لیا۔ میرے عزیز بھائیو اپنی برادری کے اکثر
حضرات کو انگریز پرستی کا مورد الزام قرار دینے سے قبل اتنا سوچ لو کہ خودداری
اور چیز ہے قومی وقار اور چیز ہے اور ذاتی التفات و محبت اور چیز ہے جسکی طرف
سے دل میں گنجایش ہوتی ہے اوسکے افعال کی جانچ کے وقت زاویہ نگاہ ہی دوسرا
ہوجاتا ہے اور مسلمان توسلوک و احسان کو بھول ہی نہیں سکتا۔ بچپن کے نقوش
ایسے مستقل ہوتے ہیں کہ مٹائے نہیں مٹتے۔ مسٹر ٹیٹنگ اور مرحوم و مغفور مولانا محمد علی
کے متعلق حسن محمد حیات صاحب نے اپنا ایک چشم دید واقعہ مجھسے بیان کیا تھا۔
جس کا ذکر اس موقع پر نہایت موزوں ہوگا۔

قید فرنگ سے گلوخلاصی ہوچکی تھی اور مرحوم کی لیڈری اپنے پورے
اوج پر تھی۔ نان کو پریشن کا زور تھا۔ لیڈروں کے دورے ہورہے تھے کہ مرحوم
بھی سوئے اتفاق سے پٹنہ پہونچے وہاں کے کالج میں ٹیٹنگ صاحب پرنسپل تھے

مرحوم سے یہہ نہ ہوسکا کہ اپنے پرانے شفیق استاد سے نہ ملیں دریا کنارے ٹیننگ صاحب کا بنگلہ تھا اور ایک شام کو مسٹر ٹیننگ نے انکو مدعو کیا حسن محمد حیات صاحب بھی ساتھ تھے۔ دونوں پہونچے تو دیکھا کہ نہایت تکلف سے ایک میز لگی ہوئی ہے اور پائین باغ میں انکا انتظار ہورہا ہے یہ دونوں مسٹر ٹیننگ سے مزے مزے کی گفتگو کررہے تھے کہ ٹیننگ صاحب آگئے اور دیوانہ وار محمد علی مرحوم پر برس پڑے میم صاحب ڈانٹتی ہی رہیں مگر صاحب نے بے طرح سنائیں کہ میرا طالب علم اور وہ بھی تمہارا ذہین اور قابلیت و ذہانت کا یہ مصرف جتنا میم صاحب نے ٹھنڈا کرنا چاہا صاحب اتنے ہی گرم ہوتے چلے گئے آخر یہہ دونوں وہاں سے ناراض ہوکر چلے آئے اور اپنی قیام گاہ پر ٹہل رہے تھے۔ مرحوم بہت مغموم تھے اتنے میں ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ مسٹر ٹیننگ اپنی گاڑی پر چلے آرہے ہیں۔

یہہ لوگ نیچے اتر کر آگئے اور صاحب کہنے لگے کہ محمد مجھے معاف کردیں اپنی غلطی پر نادم ہوں میری آرزو تمہیں بڑے سے بڑے عہدہ پر دیکھنے کی تھی تمہاری یہ ہیئت دیکھکر میں بالکل پاگل ہوگیا محمد کہو۔ کہو تم نے مجھے معاف کیا حیات کہتے تھے کہ میں نے اتنا متاثر محمد علی کو کبھی نہیں دیکھا آپ میرے استاد ہیں آپکا مجھ پر حق ہے کہکر بتیابہ رونے

لگے اور یہ تینوں مسٹر ٹینگ کے پاس واپس گئے۔ دنیا میں بہت کم لوگوں کو ایسی غیر ہزول عزیزی میسر ہوئی ہوگی جتنی کہ مسٹر کارنا اور مسٹر برون اپنی قسمت میں لکھا کر علیگڑھ آئے تھے اسپر بھی ۱۹۰۷ کے اسٹرائک میں کالج میں سات اصحاب ایسے تھے جنہوں نے مسٹر برون کے خلاف عرضداشت پر باوجودیکہ باقی سب بورڈنگ کے طلبار نے دستخط کردئے تھے دستخط کرنے سے انکار کیا اور وہ ان سے حقیقی انسیت رکھتے تھے۔

دو طلبار کی کیفیت تو مجھے خود معلوم ہے کہ وہ صاحب موصوف کے انگلش ہوس ہی سے رطب اللساں چلے آرہے تھے۔ چنانچہ مسٹر برن میں بھی باوجود علیگڑھ سے کنبہ پروری کے یہہ جذبہ مفقود نہ ہوا تھا کالج میں سید صغیر علی ریواڑی کے رہنے والے ایک طالب علم تھے اسٹرائک میں انہوں نے خاصہ حصہ لیا تھا ایکہ ان پندرہ نمایندوں میں سے تھے جو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے کہنے سے ٹرسٹیوں سے گفتگو کرنے کیلئے طلبار نے چنے تھے۔ جن میں سے تصدق احمد خاں مرحوم۔ عبدالرحمن بجنوری مرحوم قاضی عبدالعزیز صاحب اور سید محمود ۲۰ فروری ۱۹۰۷ء کو اسٹرائک کے زمانہ میں خارج بھی کئے گئے۔ جب براؤن صاحب اندور کالج کے پرنسپل ہوئے تو انہوں نے صغیر علی کو اپنی کالج میں تاریخ کا پروفیسر کرلیا۔

ایک ایسے ادارے سے جسے مفتوح قوم نے اپنی ہارمان کر فاتح قوم کے بل بوتے پر قایم کیا ہو توقعات ہی کیا ہو سکتے ہیں۔ بمصداق مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید۔ علیگڑھی جماعت کی ساری پالیسی کا دریا بند ہے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے کوزے میں یعنے نکالے جاؤ الہ باد یونیورسٹی سے گریجویٹ جن کا مذہب ہو اسلام۔ تہذیب و تمدن ہو انگریز کا۔ مگر رہے وہی اڑیل مشرقی ٹٹو جس کے تعلیمی نصاب سے مسلمانوں کو کوئی تعلق نہو۔ مگر بھیک کا تونبہ ہو انکے سکریٹری کے ہاتھ میں۔ اور اسکے پیچھے پیچھے مسلمان ٹرسٹیاں عزیز و حق تعالی کبریا ہے کی صدا لگاتے ہوے یہ کہتے چلے جائیں کہ ہے کوئی سخی داتا۔ نواب۔ تعلقدار۔ زمیندار۔ نمبردار۔ دینے والا لاٹ صاحب کے اشارے پر۔ جنکی نیک چلنی کے ضامن۔ بیک مارین اور آرچ بولڈ ہوں۔ ایسے اداروں میں تعلیم کے ساتھ تربیت کا ہونا ضروری ہے اور تربیت بھی کیسی جو پرانی ذہنیت کو بالکل بدلدے۔ پرانے تمدن کی دھجیاں اوڑا کر نیا معیار زندگی قایم کردے۔

جسمانی ترقی کے لئے ڈرل جمناسٹک کرکٹ۔ فٹ بال۔ ہاکی۔ ٹینس کا جال مہیا اور ہر کلب کا پریسیڈنٹ انگریز پروفیسر۔ پارلیمنٹری سسٹم سے واقف کرانے کے لئے یونین جس کا مستقل پریسیڈنٹ پرنسپل وائس پریسیڈنٹ اور اسکے حوارین کا انتخاب

ممبران کے ہاتھ میں سالانہ الیکشن اور وہ بھی خالی خولی نہیں معہ جملہ لوازمات کے۔ قوم کا درد پیدا کرنے کے لئے انجمن الفرض۔ یعنی چندہ جمع کرنا اور کم استطاعت طلباء کے وظائف کا انتظام کرنا۔ اسلامک کلچر کی حفاظت کے لئے ارنلڈ صاحب اور مولوی شبلی کی اخوان الصفا۔ اُردو علم ادب کی ذمہ دار انجمن اردوئے معلیٰ۔ ارنلڈ سوسائٹی ہسٹاریکل سوسائٹی حتیٰ کہ سکسپیر سوسائٹی تک قایم ہوگئی۔ القصہ سر سیّد کی کوشش بار آور ہوئی اور غدر کے کوڑوں کے بجائے شربت کے جام مسلمانوں کو عطا ہونے لگے کوئی ملازمت نہ تھی جو علیگڑھ کے طالب علم کو نہ ملی ہو اور کوئی کلکٹر صاحب ایسے نہ تھے جو علیگڑھ والے کو پسند نہ کرتے ہوں جب تک ملازمت کا چسکا لگا رہا اور ملازمت ملتی رہی سب ٹھیک ہے کا گھنٹہ بجتا رہا لیکن جب تعلیم نے آنکھیں کھولدیں اور نوکری پر اک انار و صد بیمار کی مثل صادق آنے لگی وا اُریٔن لندن کی تعداد بڑھنے کے علاوہ یورپ کا رستہ کھل گیا تو علیگڑھ اور آکسفورڈ میں پندرہ دن ہی کا فرق رہ گیا۔ نو چندری کو یہاں تو پورن ماشی کو آکسفورڈ یعنے پندرہویں کو وہاں تو پھر پہلی کو علیگڑھ۔ جب خودداری کے ساتھ احساس آزادی پیدا ہوا تو دونوں کی آنکھیں کھلیں پہلے نہ سوچا کہ قوم کی نئی پود کو مل کی لیبرٹی اور برک کا فرنچ ریولیوشن پڑھانے کا حشر کیا ہوگا۔ کچھ بھی تھے تو مسلمان

بادشاہ سمجھدار انہوں نے رعایا کی تعلیم کو طائفہ وزدان بر سر کوہے نشستہ یوں تک ہی رکھا اور کیمیائے سعادت سے آگے بڑھنے ہی نہیں" دیا الحاصل حکومت کسی کی بھی ہو اور کسی قسم کی ہو بر سر اقتدار جماعت بشرطیکہ قوی ہو یہ ہی چاہتی ہے کہ اس کے نظر التفات کے محتاج جو ادارے ہوں وہ اسی کے ہو کر رہیں جو لوگ ان کے اشارے پر چلتے ہیں انکی سرپرستی کیجاتی ہے موقع بموقع مراتب عطا کر کے انکو آسمان پر پہونچا دیتی ہے اور جو انکے مفاد کے خلاف چلتے ہیں انکو تباہ و برباد کر دیتی ہے اور اس در پئے آزادی کو حکومت کا زور نہیں بلکہ حکم رانی کا عین شعور کہا جاتا ہے چنانچہ اس کلیہ کے تحت ایک ایک ہلکا سا جھٹکا نواب محسن الملک اور وقار الملک دونوں کو سہنا پڑا باوجودیکہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے حیدرآباد کے باہر حیدرآباد کے خطابات کو محسن الملک کی حد تک تسلیم کر لیا تھا لیکن اردو ڈفنس کے سلسلہ میں وہ سرکاری خط و کتابت میں میر مہدی علی رہ گئے اور باوجودیکہ صاحب زادے آفتاب احمد خاں نے نواب وقار الملک کا ساتھ دینے میں جواں مردی کے پورے جوہر دکھا دیئے مگر نواب صاحب کو مسلم لیگ کی قیادت سے علحدہ ہونا ہی پڑا اور لیگ کو اپنا بوریا بدہنا دوآبہ کی درمیان سے اوٹھا کر گومتی کنارے بسنا ہی پڑا۔

حکومت ڈسپلن چاہتی ہے اور حکومت سے بددل جماعت بیجینی اگر سوسائیٹی کی تقسیم انہیں دو جماعتوں میں ہو تو دنیا تباہ ہو جائے اور بقول شخصے دماغ پر ایسا بار پڑے کہ بڑے سے بڑے پولیٹیشن اور اسٹیٹس مین بریلی یا آگرے میں نظر آئیں اسکے علاوہ بفکروں کی ایک پارٹی اور ہوتی ہے۔ جو ان زاہدان خشک کے حق میں معالج کا کام دیتی ہے اور تفنن طبع کا سامان مہیا کر کے خیالات میں تبدیلی اور ہنسی ہنسی میں ناصح مشفق بنکر دل و دماغ کا توازن قایم رکھتی اور حرکات و عادات میں اصلاح کرتی رہتی ہے یہ پارٹی۔

"کچھ کھا لے کچھ پی لے مرنے سے پہلے جیلے"

کے فلسفہ پر عمل کرتی ہے پس ہم جو کچھ لکھیں گے وہ اسی گروہ کے متعلق جو علی گڑھ بورڈنگ لائف کی مخصوص پیداوار ہے۔

جب ہم اسکول میں داخل ہوئے ہیں اسوقت کرکٹ کے کپتان سید علی حسن صاحب تھے اور اسکول الیون کے احمد حسین خاں اسکول اور کالج کی الیون اگر اسوقت ٹکر کی نہ تھی تو برا ضرور تھی۔ کالج اور اسکول دونوں کے کھلاڑی فرسٹ الیون میں لئے جاتے تھے اور فٹبال کے کپتان خان عبدالمجید خاں تھے۔ ان دونوں کی بادشاہت مسلم تھی۔ اسکول

اور کالج کے طالب علم کچی اور پکی بارگ میں ساتھ رہتے تھے۔ البتہ ظہور حسن وارڈین کم سن طلبا مولوی سلیم کی زیر نگرانی تھے اور مارسین کورٹ جسکو پہلے ٹو بنچیر کہتے تھے اسکول کے طلبا کے لئے مخصوص تھا۔ مگر کھانا کھانے ڈائننگ ہال ہی میں جاتے تھے۔

اردو ہندی کے جھگڑے کے بعد سر انیٹونی میگڈانل کی بارگاہ میں گھٹنے ٹیک دینے کی مستقل یادگار میگڈانل بورڈنگ جب بنا تو اسکول کے وہ لڑکے جو کچی اور پکی بارگ میں اپنے اعزا کے ساتھ رہتے تھے اودھر روانہ کئے گئے اور کچھ سال کے فصل سے ممتاز ہوس بھی تیار ہو گیا اور وہ بھی اسکول کے طلبا کے حصے میں آیا اس پانچ برس میں بہت کچھ ہوا کارنا صاحب کے ہیڈ ماسٹری کی بہار ختم ہوئی اور ریس اور شکرافٹ کا دور دورہ شروع ہوا چالیس برس اس واقعہ کو ہوئے ہو نگے لیکن میں اب بھی کہنے کو تیار ہو کہ ہندوستان کے کسی اسکول کو ایسا اچھا ہیڈ ماسٹر نہ ملا ہو گا جیسا کہ مسٹر ریس تھے ظاہر و باطن ایک نہ بلا وجہ سختی کہ بچے نام سے کانپیں اور نہ اتنی نرمی کے منھ آنے لگیں۔ اسوقت تک کرکٹ ٹیم اسکول اور کالج کی مکر کی تھی ۱۹۰۶ عیسوی تک شفقت علی رضا۔ محمود بھونڈو خدا خدا کر کے میٹرک کامیاب ہو چکے تھے اور احمد حسین خاں نواب علی وغیرہ کے

تعلیم ختم کر دینے کی وجہ سے اسکول ٹیم کا تو خاتمہ ہی ہو چکا تھا مگر یہ رئیس اور اسکراف ٹ
ہی کا دم تھا کہ اونہوں نے کرکٹ کو پھر سنبھالا ورنہ ابو الحسن علی حسن احسان الحق
معنی کا نعم البدل پیدا کرنا جوئے شیر کے لانے سے کچھ کم نہ تھا الحاصل ہلال علیگڈھ
۱۳۰۸ء کے اسٹرانک تک بدر کامل بنتا رہا۔ نواب صاحب رامپور تشریف لائے۔
لارڈ کرزن بھی آئے لارڈ کچنر کے قدم میمنت لزوم سے کالج کی زمین رشک دہ
آسمان بنی روپیہ بھی ملا صبح کی ڈرل بھی بند ہوی۔ غرضکہ ہچ ہچ سر آغا خاں کی بدولت
پرنس آف ویلز آئے۔ ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں نے قدم رنجہ فرما کر صرف اسلامی
ہمدردی کا ثبوت ہی نہیں بلکہ چندہ دیا انکے پورے سفر میں سید عین الدین اور منظفر
محمد خاں کالج کے دو جوانان رعنا ہز مجسٹی کے ہم رکابی کا شرف حاصل کرتے ہوئے
لنڈی کوتل سے شاد و فرحان واپس آتے ہیں۔

اسوقت تک یعنی ۱۹۰۱ء میں سوائے ظہور وارڈ کے باقی سب بورڈنگ
کے طلبا ساتھ کھانا کھاتے تھے اور کھانے کی بدانتظامی کی شکایت کرنا فیشن
تھا۔ میر عاشق علی صاحب مرحوم ایک پرانی وضع کے ٹرسٹی تھے انہوں نے
اپنا کھٹیا ڈائننگ ہال میں ڈال لی تھی اور بلا مبالغہ ہر وقت وہ مطبخ ہال کی

نگرانی کرتے رہتے تھے لیکن اس پر بھی شکایت اور طرح طرح سے شکایت مثلاً ایک
صاحب فرماتے ہیں کہ بریانی رات کو دھوکر تولیہ پر پھیلا دیجئے صبح کو چانول گوشت
علحدہ کر کے چانول بنئے کی دوکان پر فروخت کر لیجئے اور گوشت قصاب کے حوالے
کر دیجئے۔ نواب محسن الملک بہادر کے متعلق عام طور سے مشہور ہے کہ وہ بُری بھلی
سب سن لیتے تھے لیکن نہیں سن سکتے تھے تو ڈاکٹر شفاعت اللہ صاحب مرحوم کی
بُرائی اور ڈائننگ ہال کی شکایت۔ یہ راز ہمکو پہلے سے معلوم ہو گیا تھا اور ایک مرتبہ
ہمارے بڑا کام آیا اگرچہ یونیفارم پہنکر اس وقت تک کلاس رُوم اور ڈائننگ ہال میں
جانا لازمی نہ تھا مگر اسٹریچی ہال کے جلسوں میں اوسکی پوری پابندی کرائی جاتی تھی اور بعض
لوگ ایسے تھے کہ خود ہی ٹرکش کوٹ اور سفید پتلون نما پائجامہ کے غلام ہو چکے تھے
مثلاً سر محمد یعقوب قوم کہ کبھی ہم نے انہیں کالج میں سوائے ٹرکش کوٹ اور پتلون کے
کچھ پہنے ہی نہیں دیکھا آخر عمر میں تو وہ اچکن اور تغرارے دار پائجامہ اور دوپلی ٹوپی بھی
استعمال کرنے لگے تھے اور مجھے تو یہ بانا مرحوم کے جسم پر بہت بھلا لگتا تھا آخری عمر انکی
حیدرآباد میں گزری اور ایسی اچانک موت آئی کہ گویا مرحوم اس غرض ہی سے یہاں آئے
تھے آخر وقت تک علیگڑھ کے روایات قدیم کے علمبردار رہے خود تو مرغن کھانے

کھانہ سکتے تھے مگر احباب کیلئے انکا وسیع دسترخوان ہمیشہ تیار تھا اور کھلانے کے بہانے ڈھونڈا
کرتے تھے۔ غریب خانہ پر جب آتے تو برآمدے میں آتے ہی پکارتے تھے کہ بھائی کہاں
ہو پنجتن انکا یہ لہجہ بہت محبت آمیز ہوتا تھا۔ سید علی حسن صاحب تو بالکل ہی سوٹ پر آگئے
تھے اسوقت سے لیکر آجتک میں نے توانہیں شیروانی میں دیکھا نہیں ممکن ہے کہ ملازمت
ترک کرنے کے بعد ایک آدھ شیروانی بنوالی ہو صاحب موصوف چونکہ انما وے ہی سے
کالج میں آئے تھے اس لئے پہلے ہی دن ان سے شرف ملازمت حاصل ہوا۔ اور کرکٹ
کا سامان وقت بیوقت کھیلنے کے لئے ملتا رہا مولانا شوکت علیصاحب مرحوم کے مخصوص
دوستوں میں سے تھے اور ان کو آخر تک برابر ایک جان و دو قالب رہے۔
پالٹکس میں اصولی اختلاف رہا لیکن دوستی میں فرق نہیں آیا اکثر ایسا بھی ہوا کہ خطوں میں
روئے سخن تو میری طرف ہے اور شکوہ ہے۔ ہمارے کپتان صاحب کا میں اُن کو
کپتان صاحب کہتا تھا اور ابتک اسی خطاب سے یاد کرتا ہوں انکے بات کرنیکا خاص لہجہ تھا بہت جلدی
جلدی بات کرتے تھے۔ قسمت والے کپتان تھے ٹیم اچھی ملی اور اچھا زمانہ جب یہ بی۔ اے
میں فیل ہوئے تو میں یہ محسوس کرنے سے قاصر تھا کہ علیگڈھ کا کپتان فیل بھی ہو سکتا
ہے۔ چنانچہ میں نے اسکول کے لڑکوں سے یہ کہا کہ وہ خود کپتانی کی خاطر فیل ہوئے ہیں تو

بہت سوں کو یقین آگیا اور مجھے اس عقیدت مندی کا صلہ بھی ملا۔ دوسری خاص بات
انہیں یہ تھی کہ نواب صاحب مرحوم کا حاضر وغائب جہاں نام لینا پڑے نواب محسن الملک بہادر
سے ہی یاد کرتے تھے۔ نواب صاحب یا محسن الملک کبھی نہیں نہ کہا اور نہ کبھی اون کی
زندگی میں یا انکے بعد انکی کمزوریاں گنائیں ترکی ٹوپی کم اور ہیٹ زیادہ لگاتے تھے
خدا نے زنگ نہیں دیا انکے چھوٹے بھائی آل حسن میرے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے
وہ بھی توبت بنوبت بھائی صاحب کے گدی نشیں ہوئے مگر وہ بات کہاں۔ مارلین
صاحب اور انکا ہمنام صاحب دونوں ان سے خوش تھے اور اسی سلسلہ میں افریقہ کے ایک
چکر اور کچھ دنوں کی ملازمت سے بھی بہرہ مند ہو چکے ہیں۔ اسکول و کالج میں شیروانی
سوٹ۔ ٹرکش کوٹ سب چلتا تھا مگر کرکٹ میں اور فٹ بال وغیرہ میں ڈریس کی پوری
پابندی تھی۔ کرکٹ کا سہ رنگی فلالین کا کوٹ سب کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا اور الیون
میں آنے کی بے پناہ کوشش کھلاڑیوں کی رہتی تھی اسکے سوا سکنڈ الیون اسکول
الیون تک کا ایک مخصوص کوٹ تھا لڑکوں کو اسکے کپڑے پہننے کا خاص شوق تھا اور کیوں
نہ ہوتا کالج کی چار دیواری کے اندر روزمرہ کے آنے جانے والوں میں نوابصاحب
تھے اور صاحب زادے آفتاب احمد خانصاحب اگرچہ نواب صاحب کی ڈاڑہی

بالکل سفید ہو چکی تھی لیکن انکا اچھے کپڑوں کا شوق کم نہ ہوا تھا اور اب بھی جب بمبئی
جاتے تو عبد اللہ ہاروں اور باڈم باشیل کے دوکان سے کپڑے بنوا کر لاتے تھے۔
حیدر آباد کی شیروانیاں تو تقسیم ہو چکی تھیں مگر بند گلے کے کوٹ اور اسکے ساتھ کی پتلون
آخر وقت تک پہنتے رہے اور خاص آن بان کے ساتھ۔ انکے گندمی رخ پر ایک
سیاہ مسہ تھا جو ولایتی مٹر کے برابر ہوگا اسپر سرخ ٹوپی پہند نہ ہمیشہ پیچھے کی طرف
پڑا ہوا۔ سفید ہمیشہ برش کی ہوئی ڈاڑہی پر بھورے رنگ کا ٹرکش کوٹ
بہت کھلتا تھا خوف و جلال کے بجائے انکے چہرے پر محبت برستی تھی اور بچوں
کو انکے پاس جاتے ڈر نہ لگتا تھا آفتاب احمد خاں صاحب ماشاء اللہ سے چالیس کے
لگ بھگ میں اسوقت ہونگے مگر چہرے سے خون ٹپکتا تھا وہ بھی اس زمانہ میں
زیادہ سوٹ پہنتے تھے۔ سوائے نواب صاحب رامپور کے اور راجہ صاحب محمود آباد
کے جتنے وزیٹر علیگڑھ میں آئے سب سوٹ پہنے ہوئے آئے۔ طلباء میں بھی جس
صاحب وجاہت پر نظر پڑتی تھی بلا لحاظ ثروت و عدم ثروت وہ کوٹ پتلون
ہی میں نظر آتے تھے۔ بڑے بڑے سورما اس تمدن کے تیز دھارے پر ٹھیر نہ سکے
اور یہہ وبا اسقدر عام ہوئی کہ یونیفارم کالج اور کالج کے باہر ہر جگہ جبریہ استعمال
کرانیکی ضرورت لاحق ہوئی۔

چونکہ یہ لڑائی ممکن ہے کہ آپ میں سے بعض بھائیوں نے دیکھی بھی ہو بعض خوش قسمتوں کی قسمت میں یہ لڑائی لڑنا آیا بھی ہو۔ علی گڑھ کے میدان عمل میں یہ جد و جہد اس زمانے میں شروع ہوئی جب ہمارا کالج اتنے گریجویٹ نکال چکا جنکی کھپت ملازمت میں محال ہوگئی۔ اور اتنے زائرین لندن ہو چکے کہ اسٹریچی ہال میں نہ انکو چلتے وقت امام ضامن باندھا جا سکا اور نہ واپسی پر اونکا خیر مقدم ہو سکا۔ ایک بات اور ذہن میں رہے کہ کم سے کم یو۔پی کے لاٹ صاحب کی خدمت میں پہونچنے کا اور رسوخ پیدا کرنے کا ایک زبردست ذریعہ علی گڑھ کالج کی ٹرسٹی شپ تھا اور اس دروازے کی کنجی سکریٹری کے ہاتھ میں تھی۔ پر اکسی جیب سے نکلا کرنی تعین۔ مثل مشہور ہے کہ سگ حضوریہ از برادر دور۔ ٹرسٹی وہی ہو جاتے تھے جو ارد گرد نظر آئیں۔ نام و نمود کی خواہش ناکاموں کو گھر میں بیٹھ جانے کی بجائے عیب بینی اور عیب جوئی کے میدان میں لے آنے لگی جہاں سے اونہیں قوم کی کشتی ڈوبتی ہوئی نظر آئی اور قوم کا لیڈر کالج کے پرنسپل کے ہاتھ میں بسمل کبوتر کی طرح پھڑکتا ہوا دکھائی دیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ

زاہد کے سر پہ ایک جماوی چٹاخ سے ٭ پھر ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں

بعض ایسے بھی تھے کہ جو ٹرسٹی بننے کو اپنی قومی خدمات کے راہ میں روڑے اٹکانے سے کم نہیں سمجھتے تھے مثلاً مولوی بشیر الدین صاحب و مولوی طفیل احمد صاحب اور خود نواب محسن الملک بہادر کے عمزاد برادر مولوی سید علی حسن صاحب جو نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کی حیدرآباد سے علیحدگی کے بعد معتمدی مالگزاری و فنانس پر فائز ہوئے۔ اسطرح ایک محاذ قایم ہوا ٹرسٹی صاحبان اور ان کے مدمقابلین کا۔ دوسرا محاذ بنگیا ان انگلستانی تعلیم یافتہ نوجوانان کا جنھوں نے انگریز پروفیسران سے بہتر تعلیمی درجات حاصل کر کے کالج کی خدمت کرنا چاہی اور اپنے آپ کو قوم کے لئے وقف کرنا چاہا لیکن انگریز پروفیسر انکی برابری کے دعوی کو نہ ماننا تھا نہ مانے ان میں اگرچہ مرحوم مولانا محمد علی کا نام پیش پیش نظر آتا ہے لیکن اس حق کے پہلے طالب پروفیسری میں داخل ہوکر سردار فضل محمد خاں صاحب ہوے۔ جنکی ریاضی دانی کی توصیف میں چکرورتی صاحب رطب اللسان تھے۔ اس شیر پنجاب نے علی گڑھ کی چار دیواری پر احساس کمتری کی چادر کو چاک کر کے محض اپنی قابلیت کا بل بوتے پر بلا کسی پارٹی بندی کے انگریز پروفیسران کے مقابلے اسٹیج کی ڈوائس پر اور ڈنر کی ٹیبل پر حق ہمسائے گی طلب کیا اور قومی خودداری کے قربان گاہ پر

اپنا روشن مستقبل قربان کر دیا۔ اسکو کہتے ہیں کہ دکھ سہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔

بشجر ممنوعہ کے سائے میں صاحب زادے سید الظفر خاں صاحب ایسے قابل توقیر ذی اثر ذی وجاہت ٹک نہ سکے وہاں ہما وشما کا کیا ذکر۔ غرض کہ اس طرح دوسرا محاذ برابری کے دعوے دارول کا پیدا ہوا جس نے انگریز پروفیسران اور انکی نگاہ لطف وکرم کے اُمیدواران ووابستگان کو تیسری محاذ میں لا ڈالا۔ قسمت کی ستم ظریفی تو دیکھیئے کہ کالج کی چار دیواری کے اندر ہی ایک گروہ مسلمان قوم کا طلبائیں پیدا ہو گیا وہ بجائے ڈگری مانگنے کے حقوق سینیارٹی طلب کرنے لگا او اس چوتھے محاذ نے نہ آو دیکھا نہ تاؤ مضمون نگاری اور پمفلٹ بازی شروع کر دی جس میں نہ اپنوں کو چھوڑا نہ غیر کو ماریں پر حملہ ہو یا کار نا پر مگر تان ٹوٹتی تھی۔ صاحبزادے صاحب پر اور نواب صاحب پر۔ قومی لیڈر کہتا تھا کہ عربی التعلیم کا معیار کی پاسری بجا نا بیوقت ہے یہ نہیں جائز رکھا جا سکتا کہ مسجد کے ملا تے پھر پیدا کئے جائیں۔ دوسرے محاذ سے صدا آتی ہے کہ نکالو کسی انگریز کو ہم آرہے ہیں علم حاضر کے استاد بنکر۔ غصب ہو رہے ہیں ٹرسٹیوں اور سکریٹری کے حقوق۔ تیسرے طرف سے آواز آتی تھی کہ

خاموش ورنہ بجا دونگا اینٹ سے اینٹ۔ یہ چوتھی طرف سے ندا آئی دیکھئی دیکھئی یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ مسجد مسلمانوں کے فن تعمیر کی (debased form) ہے روکو روکو ہم ایسے فقرے نہیں سن سکتے اور پھر چاروں طرف سے آواز آتی ہے کہ سکریٹری کمزور ہے۔ کارنا صاحب تو چھپ چھپاتے نکل جاتے ہیں لیکن ذرا ماریسن صاحب کی وداع ملاحظہ ہو۔

ہم سے ہوتے ہیں جدا اب آنریبل ماریسن
چھٹتا ہے انکو ہم سے جذبہ حبِ وطن

سایہ اپنا سر سے کالج کے اٹھاتے کو ہیں وہ
جنکے سر پر تھا ہما کی طرح وہ سایہ فگن

جیسے پھیلایا مقدس پال نے دین مسیح
تم نے اور بک نے یوں ہی پھیلایا سید کا سخن

تم نے سرسید کی جو اصلاح میں حصہ لیا
قوم کی سنت ادا کی ہے یہ تم نے بے سخن

تم زمیں کے ہو نمک مصلح ہو تم اقوام کے
ہے تمہاری قوم کی خصلت یہ مشہور زمن

نوع انسان کی مدد کرنا تمہارا ہے شعار
تقویت دینا ضعیفوں کو تمہارا ہے چلن

ماریسن اور ماریسن بیگم نے ثابت کر دیا
خیر کے پتلے ہیں انگلش قوم کے سب مرد و زن

یہ اشعار کسی طالب علم کے نہیں ہیں بلکہ مصنف حیات جاوید کے جن کا پایہ سرسید کے دوستوں میں بہت بلند ہے اور کھلی کانفرنس میں انکے متعلق فرمایا گیا ہے کہ

واقعی بات یہہ ہے کہ یہہ لوگ اب یادگار زمانہ ہیں۔ نواب محسن الملک فرماتے ہیں۔

"اگرچہ میں جانتا ہوں کہ فیاض ازلی کا فیض کبھی بند نہیں ہوتا نہ یہہ ہوتا ہے کہ کسی خاص قسم کی لیاقت کے آدمی وہ ایک دفعہ پیدا کر کے آئندہ کے لئے بند کردے مگر اس بات پر یقین کیجئے کہ آسمان صدیوں چکر کھاتا ہے تب ایک ایسا قابل شخص پیدا کیا جاتا ہے جسکے پیچھے ہزاروں لاکھوں گردن زدنی آدمی چلتے ہیں۔"

اشعار بالا پرنسپل صاحب کی عارضی مفارقت کے وقت کے ہیں اب ذرا کالج کے ٹرسٹیوں کے معتمد اور جانشین سرسید کے دائمی مفارقت پر ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونیکی تفسیر ملاحظہ ہو۔

وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غمخوار | سر کر کے مہم۔ قوم کے کام آگیا آخر
جیتا تھا تو لوگوں کو گمان اسپہ کیا کیا | پر مر کے خلوص اپنا وہ جتوا گیا آخر
جو خندہ زنی کرتے تھے ہر کام پہ اسکے | وہ خون کے آنسو انہیں رلوا گیا آخر

خیر یہہ قصے جانیں اور لیڈران قوم ہم اس رو میں کہاں سے کہاں بہہ چلے ہمیں اپنی مقصد کی طرف واپس آنا چاہیئے۔ کوئی کچھ کہے کالج اور نیچری تمدن کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ کونسٹر قسکے ڈائری فارم۔ کلنرسکار نیفرکشن منٹ روم

اور ویلر کی یک اسٹال رسل گنج کے فرنیچر فروش۔ الہ الدین اور محبوب درزی
اسمعیل ٹوپی فروش۔ پہلوان میوہ فروش کا ذکر نہ آئے یہ کالج کے باہر شہر میں رہتے
تھے۔ اور کالج کے اندر آنے والوں میں ممتاز شیرینی فروش۔ غلام حسین
بسکٹ فروش۔ محمد بخش حجام۔ سوہن لال ڈاکیہ اور جج صاحب کے دہوبی کا۔
انکے علاوہ کئی خونچے والے تھے اور ایک پان والا جو کمروں کے پیچھے سے آواز لگایا
کرتا تھا۔ چونکہ ڈائننگ ہال سے صرف دو وقت کا کھانا ملتا تھا اس لئے ناشتہ
کا بار خونچہ والوں پر تھا اور وہ خوب فائدہ اٹھاتے تھے اجازت نامے میر صاحب
کے دفتر سے عطا ہوتے تھے اور عظیم الدین کمپونڈر بلتھ آفیسر کی خدمت انجام دیتے
تھے یعنی کہ ان خونچہ فروشوں کے مال کو حفظان صحت کے اصول سے جانچ لینے
کی قدرت رکھتے تھے۔ خونچے والے بھی غضب کے مردم شناس تھے قرضہ پر مال
دینے کو تیار مگر اتنا تلا نپا کہ اگلے ماہ میں وصول ہوسکے۔
بیسویں صدی کی شروع سال میں بورڈنگ میں طلباء کی تعداد چھ سات سو
سے زیادہ نہ تھی اسکول اور کالج دونوں میں۔ اس کالج کی ایک خاص خصوصیت
رائڈنگ اسکول بھی تھا جسکے کپتان ناظر الدین حسن صاحب تھے جو آجکل ڈاکٹر

ناظر یار جنگ بہادر ہیں عمر کے بعد سفید برجس پہنتے تھے جو مغرب سے پیشتر اُتار دینا پڑتی تھی۔ مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق کراماً کاتبین دو فرشتے ہوا کرتے ہیں جو کہا جاتا ہے کہ جو کچھہ مسلمان کرتا ہے وہ فوراً لکھہ لیتے ہیں۔ اور یہہ سب پس پردہ لیکن نواب صاحب موصوف کا چونکہ ظاہر اور باطن ایک ہے اس لئے ان کے نویسندہ حال میں سے ایک بشکل انسان ہمیشہ انکے ساتھہ تھا اور انکی روزانہ ڈائری مرتب ہوتی تھی بعض روایتیں ایسی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح اور شام کے کھانے کے لقمہ تک لکھہ لئے جاتے تھے کہ اتنے کھائے مگر معتبر یہہ روایت ہے کہ روٹیاں درج ہوتی تھیں صفائی مزاج میں تھی۔ قوم کا درد دلمیں بیٹھا اور تکمیل تعلیم کی کوشش عیاں۔ ولایت سے واپسی کے بعد قوم کا درد مقدم اور وکالت موخر قرار پائی چونکہ بدن اچھا تھا اسلئے جامہ زیبا اور بڑھ گئی تھی رنگین ریشم کی قمیص اور سرخ رنگ کی بو باندھنے کی طرف دل زیادہ مائل تھا۔ بسبیل لیڈری کبھی مارننگ کوٹ پہنا پڑا تو ٹائی باندھ لیتے تھے ورنہ بو اور بڑی جاذب نظر بو۔ ڈاڑھی مونڈنا روزانہ کا فرض تھا اور لکچر دینے کے موقعے کو کبھی ہاتھہ سے جانے نہیں دیا۔ اور نہ اب جانے دیتے ہیں البتہ ڈاڑھی مونڈنے کا وقت اب خضاب میں صرف

ہوتا ہے اور بائے اسکوٹس کے تقریبوں میں نیکر اور کوٹ پہن لیتے ہیں۔

گھوڑے سواروں میں یوں تو بہت سے آئے بہت سے گئے مگر میں اپنے دوستوں پر ہی نہیں بلکہ فن وقایہ نگاری پر بڑا ظلم کرونگا اگر اس سلسلے میں اپنے دوست جیکا پڑھے لکھوں میں بڑا بلند پایہ ہے ذکر چھوڑ دوں۔ یہہ حضرت صرف ٹول صاحب ہی کے منھ چڑھے نہ تھے۔ خدانخواستہ غمازی کی وجہ سے نہیں کیونکہ جو ہمارا معتقد ہو اس سے یہہ حرکتیں سرزد ہی نہیں ہوسکتیں بلکہ اپنی قابلیت اور اصول معاشیت کے انہماک کی وجہ سے۔ جو ٹول صاحب کے منھ سے نکلا وہ انکی کاپی میں درج ہوگیا اور کمرے پر آنے ہی رجسٹر میں صاف کرلیا گیا۔

کلاس میں بعض وقت تو ان کی نوٹ بک کو کتاب پر ترجیح دینے میں بھی ٹول صاحب کو عار نہ ہوتا تھا۔ حضرت شروع سے علم دوست تھے اور ہماری علمیت کے قائل یہہ ہماری نظمیں بھی جو بورڈ پر یا اور مقامات پر لکھی جاتی تھیں کاپی کرلیا کرتے تھے اور اس کا صلہ انکو یہہ ملتا تھا کہ کبھی انکو ستایا نہیں گیا اور نہ انکا مذاق اڑانے کی کسی کو ہمت ہوئی۔ کھیل کود میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے۔ ہم پر اعتبار کرتے تھے اور امتحان کے زمانہ تک میں انہیں ہمکو اپنی نوٹ بک دینے میں

تکلف نہ ہوتا تھا۔ مولوی عباس حسین صاحب قبلہ بھی انکو بہت عزیز رکھتے تھے۔
چنانچہ قادیان کے خلاف جو کتابیں انہوں نے لکھی ہیں اوس میں اپنے استاد کی
طرز تحریر کا پورا چربہ اتارا ہے اور معاشیات میں تو کمال ہی کر دیا ہے کہیں سے
صفحہ الٹو اور پڑھنے لگو یہ معلوم ہی نہ ہوگا کہ ترجمہ ہی۔ غالباً تھرڈ ایر کے آخر یا فورتھ
ایر میں انکو شہ سواری کا شوق ہوا۔ ماشاء اللہ قد تو برا نہ تھا مگر تھے ماشہ تولہ تھوڑے
ہی دن میں کہنے لگے کہ سب آسان ہے مگر دشوار گھوڑے کی سواری ہے۔ جب شام کو
گھوڑے پر بیٹھ نوسیکھوں کے ساتھ سڑک پر نکلتے تھے تو نظریں انکی طرف اُٹھ
جاتی تھیں۔ چونکہ امتحان یونیورسٹی میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی اس لئے ڈپٹی
کلکٹری انکی گھٹ تھی مگر قسمت میں لڑکے پڑھانا اور کتابیں تصنیف کرنا لکھا تھا۔
آجکل مذہب کا رنگ حد درجہ غالب ہے اور سرکاری کام سے جو وقت ملتا ہے وہ
مذہب کی خدمت میں گزرتا ہے ہمیشہ بلاقیمت ہمکو انکی کتابیں ملتی ہیں اور ہم انکو صرف
پڑھتے ہی نہیں بلکہ احتیاط سے رکھتے بھی ہیں۔ شہسوار میدان فصاحت و بلاغت ہی
نہیں مرد میدان عمل بھی ہیں مگر پشت اسپ پر۔ خیر اسکو جانے دیجئے۔ موٹر تو خود بھی چلا لیتے
ہیں حج بھی کیا ہے باقاعدہ زکات نکالتے ہیں البتہ اب قبر نبی پر فاتحہ دینا

چھوڑ دی ہے ہم انھیں برنی اور دنیا ئے ادب سے رخصت کرتے ہیں حاجی مولوی الیاس برنی صاحب کہتا ہے یہ اُن چند کتابوں کے کیڑوں میں سے ہیں جن کے تعلقات کھلنڈروں سے بھی رہتے ہیں اور مذاق کے داد دینے کی اہلیت باوجود احساس علمیت رکھتے ہیں

اب ذرا پیادہ پلٹن ملاحظہ ہو۔

رائیڈنگ اسکول کو جو امتیازی درجہ حاصل ہوا تھا اس کا سہرہ اسکول کے سر نہ تھا بلکہ سر جارج روس کیپل چیف کمشنر پشاور اور مرحوم سر افسر الملک بہادر کے۔ سر جارج کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ اچھے خاندان کے لڑکے سرحد سے علی گڈھ تعلیم کے لئے جائیں چنانچہ وہ لوگ آتے تھے اور اگرچہ رائڈنگ اسکول میں شریک نہیں ہوتے تھے لیکن سالانہ اسپورٹس اور نمائش میں باوجود اسکے کہ گھوڑے اس قابل نہ تھے یہ لڑکے کبھی اسکول اور کبھی روساء کے گھوڑے لیکر بازی لیجاتے تھے۔ اس قبیل کی دوسری کھیپ اُن حیدر آبادیوں کی ہوتی تھی جنکو سر افسر فوج میں بھرتی کر کے تعلیم ختم کرنے کے لئے علی گڑھ بھیج دیتے تھے مثلاً بریگیڈیر قادر بیگ نواب قادر یار جنگ بہادر، بریگیڈیر نواب ولایت یار جنگ، کرنل عبد الصمد اور انکے بھائی عبد الواحد اس زمانے میں ایسے حیدر آبادیوں کی خاصی تعداد تھی اور ان لوگوں کے قدم ملا کر چلنے کا

خاصہ اثر پڑتا تھا ورنہ پیا وہ پلٹن کی یہ حالت تھی کہ بانس کا ڈنڈا ہاتھ میں لیکر سرفراز خاں صاحب کے آواز پر قدم ملا کر چل لیا کرتے تھے اور فزیکل ڈرل کی ابتدائی مشق۔ نہ اسکی اہمیت کبھی سمجھ میں آئی اور نہ آگے چل کر اسکی مسدودیت۔ البتہ سرفراز خاں صاحب کی شخصیت جو اس ڈرل کے رُوح رواں تھے علی گڑھ کی تاریخ میں جلی حروف میں لکھی نظر آتی ہے۔ باوجودیکہ وہ اسکول سے آگے نہیں بڑھے لیکن انکا اثر کالج اور کالج کے باہر امتحان پاس کرنے والوں سے کسی طرح کم نہ تھا۔ لوگ جانتے ہیں کہ وہ اپنے گھر سے آئے لیکن ایسے آئے کہ پھر گھر کا نام نہیں لیا۔ اپنے آپ کو اچھے کھلاڑیوں میں بتلاتے تھے۔ ڈیل ڈول میں یوں سمجھ لیجئے کہ گورنگ کے ہم جسم تھے عمر کے ساتھ زندہ دلی بڑھتی گئی۔ ہر عمر کے لوگ اونکے دوست تھے۔ غالباً اس وجہ سے کہ ہم اونکے سب سے چھوٹے بھائی کے ہم عمر تھے اور ہمارے بزرگ خاندان کے ساتھ کے اس لئے مجھسے نورالدین، غضنفر محمد خاں مقبول، سردار منظور اور ایک دو اور طلباء سے بیٹے حجابانہ مذاق سے گریز کرتے تھے قسم ہے قرآن کی ایک زمانے میں تکیہ کلام تھا۔ منھ پر بیٹھے پیچھے جب کسی پر کوئی پھبتی سوجھ جائے تو اُسی کہنے میں چوکتے نہ تھے۔ بندوق کے حادثے سے اونکی ہتھیلی زخمی ہو گئی تھی۔

اس لئے کرکٹ چھوڑ دی تھی لیکن دلچسپی برابر لیتے رہے شام کو گھومتے گھامتے نیٹ
کے پیچھے آکر کھڑے ہو جاتے تھے لیکن اسٹرائیک۔ سے کچھ پہلے یہ عادت ترک ہو چکی تھی۔
انگریزی ٹورِیس اور انگریزی تمدن انہوں نے بھی اختیار کر لیا تھا۔ ہاتھ میں نقص آجانے
کے باوجود ٹینس کھیل لیتے تھے۔ اس زمانے میں ٹینس طلباء میں عام نہ تھی۔ یونین
کے کورٹ پر وفیسر ابوالحسن صاحب اور انکے دوستوں کے لئے مخصوص تھے۔ پروفیسر صاحب
ایسے ویسے کھلاڑی سے بھاگتے تھے۔ خاں صاحب کی وجہ سے کھیل بگڑا ہو مگر اس
متانت زدہ گروہ میں زندگی کے آثار آس پاس سے گزرنے والیکو خانصاحب کی
آواز سنکر نظر آجاتے تھے۔ کالج کی پالیسی کی حد تک وہ صاحب زادے آفتاب احمد خاں
کے مستقل مقلدین میں سے تھے مگر مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے ساتھ جب وہ
کالج میں آئے تھے (مولانیت سے پہلے کے زمانے میں) خانصاحب مذاق کی صحبتوں
میں حصہ لینے میں کبھی دریغ نہ کرتے تھے اور نہ کبھی آپس کی ہنسی دلگی میں تو تو میں میں کی نوبت
آئی۔ بامن شراب خورد و بذا ہد شاز کرد انکا مسلک تھا اور اسمیں پورے اُترے
تعلیم چھوڑنے کے بعد بھی پکی بارگ میں انکا آنا جانا نہ چھوٹا بوڈرنگ میں اونکا اثر تھا
صاحب لوگ اُن سے خوش تھے خانصاحب کے پرانے ساتھی صاحب اولاد ہی نہ ہو چکے

تھے بلکہ انکے بچے بورڈنگ میں داخل ہونے کو آنے لگے تھے ایسے موقع پر ایک
نہ ایک قصہ خانصاحب ضرور سناتے اور انکے زیادہ فقرے اُنکے احباب ہی پر چست
ہوتے ہنسنے کی بہت عادت تھی غم پاس نہ آنے دیتے تھے اُنہیں کالج کے
در و دیوار سے عشق تھا مدت العمر علی گڑھ میں رہے۔ تھے تو سب رجسٹرار مگر کپڑے
اس ٹھاٹ کے پہنتے تھے کہ صدر اعلیٰ معلوم ہوتے تھے۔ اُنکے دو بھائی اکرم
اور سرور گریجویٹ ہوئے دوست پرست اور سادہ مزاج تھے ظرافت و مذاق
کی کوشش کرتے تھے مگر اپنے بھائی کا چربہ اُتارنے میں بری طرح ناکامیاب ہوئے
نان کا پیریشن میں سنا تھا کہ خدمت سے علیٰحدہ ہوگئے البتہ سرور خاں نے عملیت
کی کمی پوری کردی اور اپنے بڑے بھائی کے حصے کا علم بھی حاصل کرلیا اسٹرائیک
کے بعد کے دور میں سرور کے دم سے بورڈنگ میں بہت چہل پہل رہی۔ نئی پود کی
شوخی شرارت خواہ کتنی ہی تعریف طلب اور انوکھی کیوں نہ ہو مرحوم اوس کے
قائل نہ ہوتے تھے اور کہدیا کرتے تھے کہ قسم ہے قرآن کی ابھی لونڈے ہو۔ نمائش
میں عموماً صاحب زادے صاحب کی ٹولی میں نکلتے تھے۔ قوم کا لیڈر کوئی ایسا نہ
تھا کہ جسے خانصاحب بلاطے چلے جانے دیں۔ پرائے پھٹے میں پیر دینے کی

اونکی عادت نہ تھی نہ اوہر کی اودہر لگاتے تھے وہ خوش رہتے تھے اور خوش رکھنا چاہتے تھے وہ پرانے علیگڑہ کے ایسی روایتوں کے جو سینہ بسینہ پہونچتی ہیں زندہ مثال تھے اور علی گڑہ کے کھلنڈروں میں عدیم المثال۔

قوم مرحوم کے ساتھ درد محبت کا اظہار۔ اچھی ملازمت کے حصول کا انتظار۔ یک کرشمہ دو کار کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ تعلیم سے فارغ ہو کر یا کم سے کم گریجویٹ ہو کر نواب محسن الملک بہادر یا یوں کہئی کہ سکریٹری صاحب کا پرائیوٹ سکریٹری بنکر قوم کی خدمت کیجائے چنانچہ اس زمانے میں سید سجاد حیدر صاحب یلدرم نواب صاحب کے پرائیوٹ سکریٹری تھے دفتر مہدی منزل میں تھا اور نواب صاحب بھی تقریباً روزانہ یہیں آکر کام کرتے تھے اور قوم کے بیمار کے لئے دینار طلبی جاری تھی ہمارا اُن سے صرف چند روز یہ واسطہ رہا کہ نواب صاحب کے پرایوٹ اکونٹ میں سے پیسے لے آئے تھے۔ صاحب موصوف کی ذہانت کی کالج میں شہرت تھی۔ بدن میں پھرتی اور چہرے پر شگفتگی تھی سوٹ پہنتے بلا تیلیول کی ناک پکڑنے والی عینک لگاتے تھے اور شوق تحریر مضامین میں کھلے جاتے تھے۔ کچھ دنوں بعد درد قوم کا بازار ظفر عمر کے سر ڈال آپ ترکی تہذیب و تمدن کا وبال ساتھ لیکر ڈپٹی کلکٹری پر چل دیئے۔

لوگ کہتے ہیں کہ انکے بعض ناول اردو علم ادب کی جان ہیں زمانہ کتنا ہی جلدی گذر جاتا ہے۔ زمانہ ملازمت ختم کر کے کچھ عرصے سے صاحب موصوف مہاراجہ صاحب محمود آباد کی سکریٹری کی حیثیت سے پھر قومی اکھاڑے میں ہیں انکے کئے بھائی علیگڑھ سے گریجویٹ ہوکر اچھی خدمتوں پر سرفراز ہوئے۔

ظفر عمر صاحب اور ہم اگرچہ قوم و کالج کے معاملات میں پیر بھائی ہیں لیکن ایک بڑی حد تک وہ ہمارے استاد اور رہبر ہونے کا مطالبہ کر سکتے ہیں علیگڑھ اور اسلامیہ اسکول کے معاملات میں انہوں نے ہماری۔ رہبری کی اگرچہ اکھاڑے میں مرحوم مولانا شوکت علی لائے لیکن عملی کاموں میں ظفر عمر صاحب ہمارا بچپن سے دل بڑھاتے رہے اسٹرائک کے بعد سے جب ہم نے یہ کوشش شروع کی کہ ہر سال اسلامیہ اسکول سے جو طلباء کالج میں آئے ہیں اونکا بھی ایک امتیازی درجہ ہو اور وہ اسکول سے پاس کئے ہوئے طلباء کے دوش بدوش کالج میں پرانی روایتیں علیگڑھ کی قایم کرنیمیں کوشاں رہیں اس سلسلے میں ہماری انکی برابر خط و کتابت رہی۔ ہم نے جو کچھ خاموش کام کیا وہ رائگاں نہ گیا اور ٹرسٹیوں کو بشیر الدین کی شخصیت اور ملک کو اسلامیہ اسکول کی اہمیت ماننا ہی پڑی ڈاکٹر سید محمود۔ اور بمبئی کے کانگریس

گورنمنٹ کے منسٹر مسٹر نوری اسی اسکول کے چشم و چراغ ہیں اور فلک علم و عمل
کے درخشاں مہتاب ڈاکٹر ذاکر حسین ایسے تو جب پیدا ہوئے ہیں کہ زمانہ پورے
سو سال اسی تک و دو میں صرف کرے اُتا وہ اسلامیہ اسکول کے روشن آفتاب
ہیں۔ ظفر عمر صاحب کو نواب محسن الملک بہادر سے ایسے زمانے میں قریبی تعلق
پیدا ہوا جبکہ اردو ناگری کے جھگڑے کے اثرات باقی ہونے کے علاوہ نئی نئی
اُلجھنیں پیدا ہو چکی تھیں اور نئی کالج کی طالبانہ زندگی کے مصروفیات بھی کچھ کم
نہیں، فٹ بال کے کپتان تھے انکے مفصل تذکرے کی ان چند صفحات میں گنجائش
نہیں اور سونے پر سہاگہ یہ کہ اولڈ بائز ریفارم لیگ میں وہ اور میجر سعید محمد خاں
کرکٹ کپتان مولانا ئے مرحوم کے دست و بازو تھے ان لوگوں کے لئے تو پوری
ایک کتاب چاہئی۔ اُنکے چھوٹے بھائی آفتاب عمر کا ہمارا بچپن سے ساتھ رہا وہ
بڑے طباع تھے ظرافت سے پُر۔ بڑے بھائی کی طرح سوٹ کے قائل نہ تھے۔
کرکٹ ٹیم جب پہلی دفعہ نینی تال گئی ہے تو انہوں نے فرمایا تھا۔

جتنے انگریز ہیں چڑھ جاتے ہیں گرمی میں پہاڑ ۔۔ یہ نہیں جانتے ویگا کوئی بان پچھاڑ
ٹیم کیا بات تری۔ زور دکھایا اچھا ۔۔ زعم کا اُنکے وکٹ۔ تو نے دیا جا کے اُکھاڑ

ایک لینے گئے اور باندھ کے لائے بارہ
جو مقابل ہوا تیرا اُسے کس کر مارا

اکھاڑ پچھاڑ ایسے مزیدار قافئے اور بھی باندھے تھے مگر مجھے اسوقت
یاد نہیں ملازمت کے زمانے میں بھی ظفر عمر صاحب علیگڑھ میں آتے جاتے تھے
اور طلبا ر سے ربط قایم تھا ۔ ایف اے پاس نہ کرنیکی سزا میں دوسرے دوستوں
کی طرح مجھکو شفقت ۔ اور بہو ندو کو بھی ایک ٹرم کے لئے کالج چھوڑنا پڑا تھا ۔
آگرے علیگڈھ میں فرق ہی کیا تھا علیگڈھ اس کثرت سے آئے تھے کہ خود ای آئی
آر والوں کو یہہ گمان تھا کہ ریلوے میں ملازمت کرلی ہے ۔ ٹول صاحب جوں کہ
واقف تھے ۔ واپسی پر مبارک باد دیتے تھے اور انکے وہی حقوق قایم رکھتے تھے
جو ایسے طلبار کالج کے تھے ۔ جنکو بن باس نصیب نہ ہوا ہو کیونکہ ایف ۔ اے
میں فیل ہو جانا قومی ضروریات کے تحت بھی ہوتا تھا ذاتی اغراض کے لئے بھی ہر سال
ایسے بن باسیوں کے تعداد پانچ سات ہوا کرتی تھی جنکو آگرہ کالج کے پرنسپل مسٹر
جونس اور سینٹ جانس کالج کے ریورلینڈ ہمیشہ آغوش شفقت میں لینے کے منتظر
رہتے تھے ۔ اونکی کوشش یہہ رہتی تھی کہ جو محبت طلبار کو علی گڑھ سے باوجود ان

زخموں کے جو کبھی دانستہ اور کبھی نادانستہ پہونچتے رہتے ہیں اونکے کالج میں بھی پیدا ہو۔ آرچ بولڈ صاحب کے جانیکے بعد جب مسٹر ٹول کے نام پرنسپلی نکلی تو قرعۂ فال پرا کسٹری ہمارے ڈاکٹر صاحب کے نام نکلا اسٹرانگ کے بعد یہہ مارین صاحب کی جانشینیوں کے دوسری شکست تھی اور علیگڑھ میں انگریز کے خلاف پہلی بدعت یعنے گولڈی بروس۔ ڈنیکلف وغیرہ کو بورڈنگ کے معاملے میں ڈاکٹر صاحب کی قیادت تسلیم کرنا ہی پڑی ڈاکٹر صاحب سے میری مراد لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سے ہے ماشاء اللہ ہمارا کالج طلسم ہوشربا سے کم نہیں کہ اسمیں پہلوان در پہلوان نکلتے چلے آتے ہیں جس طلسم میں امیر حمزہ کے ہم مذہبوں کا داخلہ بند تھا وہاں یہہ مرد میدان پہونچا کس طرح۔ اور کس طرح اس طلسم کو فتح کیا جسکی لوح صوبہ کے سب سے بڑے افسر اعلیٰ کے ہاتھ میں تھی۔ اس سے پہلے ہم تذکرۃً بیان کر چکے ہیں کہ انگلش اسٹاف میں ہندوستانی کا داخلہ بند تھا یا یوں کہئے کہ جو مقام انگریز پروفیسر کو حاصل تھا اس پر کالا آدمی نہیں پہونچ سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے معاملے میں کچھہ لغزش مارین صاحب ہی سے ہو گئی یعنے انہوں نے حد سے زیادہ تعریف انکی علمیت کی کی۔ یہہ سارٹیفکٹ جو اتفاق سے ہاتھ آ گیا تو نواب محسن الملک نے اوس سے پورا فائدہ اٹھایا جسوقت

یہہ واپس آئے علیگڈھ میں بڑے زور وشور سے انکا استقبال کیا گیا طلبا ریں اتنا جوش تھا کہ مشکل ہی سے پھر اوسکے بعد نظر آیا ہو وہ توں پلیٹ فارم اسٹیشن کے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب تھے اور احباب کے کاندہے۔ مسلمانونکی عام مسرت کا یہہ سلسلہ ڈھاکہ کانفرنس تک جاری رہا انکی ڈگریاں۔ مارین صاحب کی تعریف اور یہہ مظاہرے راس آئے اور انکو انگریز پروفیسروں کے گریڈ میں لینا ہی پڑا۔ اسکے بعد بھی انہیں بڑہانے کے پے ور پے کوشش کیگئی۔ اقتدار اور زر کے سبز باغ دکھائے گئے۔ مگر اس میرے شیر نے علیگڈھ سے جانیکا نام نہ لیا جب تک یہہ تھے اور انکا علمی شغل انکا بڑے سے بڑا مخالف بھی انکا مداح تھا۔ آمدم برسر مطلب۔ مارچ میں امتحان ختم ہوا بقول شخصے کہ جو ہی پار کسکے۔ دم لگائی اور کھسکے۔ اسی دن رات کو علیگڈھ میں داخل بورڈنگ کے کچھہ کمرے خاص لوگوں کے لئے مخصوص تھے۔ چنانچہ مغربی یچی بارگ کے چند کمرے ہم لوگوں کے دیرینہ قبضے کی وجہ سے ملکیت ہوکر رہ گئے ہم کہیں ہوں مگر ساماں وہیں رہتا تھا۔ تقی۔ مسعود۔ نقی۔ جعفری۔ واجد نقی الحسن۔ ظہیر الحسن۔ محمود الحسن۔ میں خلیق الزماں۔ حیدر حسین۔ علی رضا۔ زاہد اسی طرف تھے اس سمت کا تھانہ نمبر پچاس میں تھا۔ پروفیسر محمد حسین صاحب کے جاتے ہی

سید محمد اعظم لطف احمد اور عبدالسلام اس میں آ داخل ہوئے اور ہم جب واپس ہوئے تو اس تبدیلی سے بہت خوش ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے جن صاحب کو اسطرف سب پراکٹری پر بھیجا وہ اس کمرے سے محروم رہے۔ اور پہا ٹک کے ملے ہوئے کمرے کے بازو والے کمرے میں رہنا پڑا۔ ہمارے آنے سے پہلے ان پروفیسر صاحب سے اور اس بارگ والوں سے خاصی تناتنی تھی ہم جب واپس ہوئے تو حسب عادت اِکّے سے کود اپنے پرانے کمرے کی طرف بڑھے جن طلبا نے ہمیں دیکھا مسرت کا اظہار مختلف فقروں میں حسب مراتب کیا۔ اودھر واجد اور خلیق ہمارے خیر مقدم کو نکلے ہم لوگوں سے جو بھائی واقف ہیں وہ خیال کرسکتے ہیں کہ اسوقت جبکہ ہم چھ ماہ کے بچھڑے ملے تھے کیا ہی سلیس اردو اور کیسے تلفظ کی صحت کے ساتھ بولی گئی ہو گی۔ واجد حسین صاحب حالانکہ ڈپٹی کلکٹری کے آخری منازل میں ہیں مگر وہ ہی ہیں اور ہم بھی نہیں بدلے البتہ اُس خلیق اور بلقان سے واپسی کے بعد کے خلیق میں غضب کا فرق ہے وہ تازگی شگفتگی۔ مسکراہٹ۔ شوخی شرارت عنقا ہے۔ قوم کی مسلمہ لیڈری ہے اور یہ۔ چہرے پر اداسی۔ شوخی کے بجائے آنکھوں سے یاس ٹپکتی ہے متانت انتہائی درجہ پر ہے البتہ عزم وارادہ

ہے کہ مشعل اسلامی کی گرمی سے قایم ہے اور پاکستان کے سہارے پر زندگی۔ اپنا
اپنا نصیب ہے اور توفیق ایزدی۔

سرمدِ غم عشق بوالہوس را ندہند — سوز پر پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار — ایں نعمت عظمیٰ ہمہ کس را ندہند

پاسباں مل گیا کعبے کو صنم خانے سے اب یہ ہیں، اور قوم مرحوم کے درد
میں مدراس اور پنجاب کے دورے۔ ہم پروفیسر صاحب کو فرسٹ ایر کا طالب علم اور وہ
ہمیں ناخواندہ مہماں سمجھے۔ تیسرے دن اطلاع آئی کہ مہمانداری ختم اور آپ جائے
ہم کیا جانے والے تھے۔ ٹول صاحب نے فیصلہ کیا کہ فیل ہونے کے سلسلے میں جنجو کالج
میں دوبارہ نہیں لیا جاتا وہ حقیقت میں کالج سے نکالے نہیں جاتے بلکہ انکی مفاد کے
مدنظر ایک ٹرم کے لئے انہیں کالج میں نہیں لیا جاتا تاکہ وہ دوسری جگہ جاکر پورا وقت
کتابوں کو دیں ڈاکٹر صاحب کا بہ حیثیت اعلیٰ نگراں بورڈنگ یہ حکم صادر ہوا کہ میزبان بدلتے
رہیں تو مہماں کے ایام بلاقید بڑھتے چلے جائیں گے دو تین احباب ہی کے نام سے ہمارے
کھانے کا ٹکٹ کٹنے پایا تھا کہ استاد حلیم نے جو شفقت اور علی رضا کے ایف۔ اے
میں فیل ہوجانے کے باعث کرکٹ کپتان ہو گئے تھے اپنے عدم موجودگی میں ان کی

دیکھ بھال کیلئے ہمارے نام اشکرافٹ صاحب کا خط بھجوا دیا۔ اور ہم کو جو محض گرمیوں
کے کپڑے لینے آئے تھے پوری گرمی علیگڑھ میں کاٹنا پڑی اور پروفیسر صاحب کے بچپن
اور ناسمجھی کا قائل ڈاکٹر صاحب اور ٹول صاحب دونوں کو ہونا پڑا۔

بورڈنگ لائف میں گرمیوں کا زمانہ بھی عجیب پرکیف زمانہ ہوا کرتا تھا دن بھر
خس کی ٹٹی اور پنکھا۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے طلباء تو الہ آباد یونیورسٹی کا امتحان دیکر
اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے ایک دو ایسے بھی تھے کہ گرمیاں یہیں گزار دیتے مگر
بورڈنگ فی الواقعہ فرسٹ ایر اور تھرڈ ایر سے ترقی پائے ہوئے اور تا حال ناکامیاب
امتحان کے قبضے و تصرف میں رہجاتا تھا۔ پڑھنے پڑھانے کا مشغلہ معدودے چند ہی
کی حد تک رہتا اور اس دور کا افتتاح سالانہ نہایت تزک و احتشام سے اپریل فول
کے خطابات کے فہرست کی تقسیم سے کیا جاتا تھا۔ ہمارے کالج کی یہ پرانی رسم ہے
جو صحت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب سے شروع ہوئی۔ خطاب طلباء ہی کو عطا ہوتے
تھے البتہ ۱۹۰۸ء میں دو چار پروفیسر بھی بہرہ یاب ہو گئے اور بہت اچھلے کودے۔
بعض وقت ایسا بھی ہوا ہے کہ جب ایک نام کے کئی طلباء جمع ہو گئے تو انکی ظاہری
یا باطنی خصوصیات کے مدنظر انکو خطاب دیدیا گیا جو بعض صاحبان نے تو منظور بھی کرلیا

عبدالحمید خاں سولجر۔ عبدالحمید خاں ٹرکی اشفاق وڈہاوس۔ اشفاق ڈگلس۔ محمد حسین
انگلش کٹ۔ محمد حسین متر۔ ظہیر فاریابی۔ ظہیر لوفر۔ محمود ہل ٹُل۔ محمود قوم۔ حامد کیٹ
لارڈ حامد۔ حافظ اسحاق۔ لارڈ اسحاق۔ حافظ ریاض۔ ریاض رفین۔ ابوالحسن
پروفیسر۔ ابوالحسن صاحب۔ ابوالحسن کالیہ۔ ابوالحسن یوم چک وغیرہ وغیرہ۔ کہا یہ جاتا
تھا کہ خطابات شایع کراکر پہلے سے رکھ لئے جاتے تھے اور اپریل کے پہلی کو کمروں
میں ڈال دئے جایا کرتے تھے کمال تو یہ ہوتا تھا کہ کسی کو پتہ نہیں کہ کب چھپ کر آئے
کہاں سے آئے جن لوگوں نے ہنسی میں ٹال دیا اونکا معاملہ گیا گزرا ہوا جنہوں نے
برا مانا اونکی جان عذاب میں ہوگئی ہر طرف سے اوسی خطاب کی آواز آتی تھی۔
مختلف زمانے میں یہہ کام مختلف جماعتوں نے کیا ملبوتوں کی جماعت کیطرح سے اسکی
کوئی منتظم پارٹی نہ تھی ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ ایک صاحب کے پاس چھپا ہوا پلیندا آگیا
اونکو خبر بھی نہ تھی وہ بیچارے خاموش ہو رہے افسے کہا گیا کہ اسکو کہیں چھپا دو۔
چنانچہ اونہوں نے اس ٹیوب میں جسکے اوپر برآمدے میں پانی پینے کے مٹکے دھرے
رہتے تھے وہ پلندہ رکھدیا جو یوم مقررہ پر تقسیم ہو گیا۔ راتوں کو پارگ کے سامنے
پلنگ ڈالدئے جاتے اونکی لین ایک طرف سے شروع ہوکر دوسری طرف تک برابر

چلی جاتی تھی اور چاندنی راتوں میں ان پلنگوں کے سفید چادریں بڑا مزہ دیتیں تھیں
اس میں کسی کا گنگنانا۔

آسماں پر چاندنی ہے اور زمیں پر چاندنی
ہو رہی ہے تیرے دم سے آج گھر گھر چاندنی

یہ ہی زمانہ فاختہ اڑانے۔ بستر چھپانے۔ پلنگ اٹھانے اور مختلف مذاق
اور شرارتوں کا ہوتا اس سال پروفیسر صاحب کی ٹی ٹی لڑکوں کی نظر میں کھٹکی اور چند
منچلوں نے کاندھوں پر رکھکر "زنی چڑو" بول دیا۔ مہدی منزل کے سامنے
سے شعلے اوٹھ رہے ہیں اور پروفیسر صاحب کے پلنگ کے قریب ایک صاحب پڑے
ہوئے گا رہے ہیں کہ سردی اب پڑی ہے اتنی شدید۔ صبح نکلے ہے کانپتا خورشید۔
یہہ واقعہ کچھہ اس پھرتی اور تیزی سے ہوا کہ۔ ساری بورڈنگ میں دھوم
مچ گئی۔ کسی نے سوگ کیا کسی نے بروگ کیا واجد کی رائے ہوئی کہ ٹی ٹی اٹھوا کر سبکو
دوڑایا جائے جو مہدی منزل پہلے پہونچے یہہ اُسی کا کام ہے نقصان کی تلافی کی
صورتیں سوچی گئیں۔

سنجیدہ شرارت اور لطیف ظرافت حاصل کرنے سے حاصل نہیں ہوتی وہ تو

کچھ خدا کی دین ہے بعض لوگ دیکھا دیکھی شرارت کرنے کو نکلتے ہیں اور خود پھنس
جاتے ہیں بعض وقت ایسے بھی نتائج مذاق ہی مذاق میں پیدا ہو جاتے ہیں۔
جن کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ واحد اور عبداللہ خاں دونوں اسکول میں تھے
اور احمد حسین بنتے بی۔ اے میں تھے واحد کے دماغ میں کیا بلکہ اسکو معلوم ہی نہ
ہوگا کہ سن ۱۹ء میں عبدالصمد۔ بشیر علیخاں۔ سید احمد۔ محفوظ علیخاں اور عرفان،
ابراہیم برمی اور عبدالحمید خاں کی سخت جنگ ہو چکی ہے۔ ان دونوں نے
احمد حسین بنتے کی فاختہ اڑا دی۔ چونکہ اونکے پیر میں پھنسیاں تھیں اس لئے اونہیں
سخت تکلیف ہوئی۔ ایسی حالت میں فاختہ اڑانا کسی طرح جائز نہ تھا۔ فاختہ
فلائنگ کیمپنی کی غرض و غائت یہ تھی کہ چستی اور ہوشیاری پیدا ہو۔ اسی لئے
فاختہ بنانے میں کم سے کم روئی استعمال کرنا فرض تھا بعض استادان فن
تو روئی کو اسقدر پتلا کر لیتے ہے کہ فاختہ اوڑانے کا نشان بھی پیر پر نہ پڑتا
تھا۔ مقصود صرف یہ ہوتا تھا کہ سونے والے کی نیند ہوشیار ہو جاوے
اور وہ پیچھے بھاگے اس طرح سے بہت سے لوگوں کا ڈر خوف نکل جاتا تھا جب

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی۔

تو آبرو ے اہل نظر کی طرح اصل منشا، اس تفریح کا بھی فوت ہو گیا۔ احمد حسین،
عبداللہ خاں واحد تینوں فٹ بال بھی کھیلتے تھے مگر عبدالصمد اور واحد کا بھائی
بھائی ہوتا پھر رنگ لانے والا تھا دونوں طرف سے ہاکی اسٹک سنبھل گئیں۔
عبداللہ خاں موقع کی نزاکت سمجھ گیا اور نہایت بے ساختگی اور بے پرواہی سے
کہنے لگا کہ بھائی قصور خریدار کا بال بھونری اسے پہلے دیکھ لینا تھی احمد حسین
کے بھنسیاں تھیں ہم جا کر معافی مانگے لیتے ہیں آپ لوگ سو جائیں۔ یہ واحد کرنل
عبدالصمد کے بھائی تھے اور کرکٹ، فٹ بال، ہاکی۔ نیزہ بازی سب میں اچھے تھے۔
حضرت بڑی بد تھے (بد کالج کی اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے) جب کچی اور پکی بیرک
سے اسکول کے طلبا ریڈ مارے گئے تو یہ دونوں کچی بارگ سے ماریسن کورٹ میں
رونق افروز ہوئے اور امیر احمد اور احمد کمال پکی بارگ سے روشن کن میکڈانل ہوس
ہوئے جب ان لوگوں کے پلنگ نکلے تو عجیب کہرام مچا اتفاق سے یہ چاروں
کھلاڑی تھے اور عمر کے لحاظ سے بھی کالج والوں سے بیٹھے نہ تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ
میت پہ میت نکل رہی ہے سوائے کفن پہنا کر ٹال دینے کے اور کوئی رسم باقی
نہ تھی۔ کمال تو ایک صاحب نے کیا پلنگ کا پایا پکڑ کر زہر عشق پڑھنا شروع کر دی۔

گھر میرا آج بے چراغ ہوا تھا ۔ وہ پیدا جگر یہ داغ ہوا

دوسرے صاحب نے فقرہ چڑا کہ پہچان لیا یہ ہی ہیں میت کی اماں ۔

اسی زمانے میں ہر دور آم کے ٹرپ بھی خور بوزوں کی خاطر ہوا کرتے تھے باغوں پر ہلے ہوتے تھے مگر باغ کے پھلت خریدنے والے کو کبھی نقصان نہ رہتا تھا اور وہی بار بار خرید تا تھا۔ لڑکوں کا بھی مقصود شوخی و شرارت سے زیادہ نہ ہوتا تھا۔ اور وہی لوگ ان میں دو گنے سہ گنے داموں پر آم مول لیا کرتے تھے۔ پہلی بارش پر مڈ تھروانگ کی رسم ہو کر گھر جانے کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں اور لانگ وکیشن آجاتا تھا۔ مڈ تھرونگ جان جوکھوں کا کھیل نہ تھا مقصود صرف اتنا تھا کہ خود بھی یہیں بارش میں نہائیں اور سب ساتھی بھی۔ ہاتھ پیر کی کسل نکلتی رہے اور دھینگا مشتی بھی۔ بعض لوگوں میں اس تکلف کے ساتھ نسائیت داخل ہو جاتی تھی کہ وہ اپنا سینہ دکھانا عصمت دری کے برابر سمجھتے تھے۔ اور نیکر یا تہ بند باندھ کر آتے شرماتے تھے بعضے ایسے مرزا پھویا تھے کہ پانی میں بھیگتے ڈرتے تھے انکی خدمت میں مجبور ہو مڈ یعنی کیچڑ پیش کرنا پڑتی تھی ۔ عبداللہ خاں کی ذہانت کے ساتھ ایک عبدالواحد صاحب کی سادگی بھی فاختہ اڑانے کے معاملے میں سن لیجئے۔ ان عبدالواحد

کو بیہودہ گو کہا کرتے تھے اور ان عبدالواحد کو کالیہ یا کمالٹیں کہا کرتے تھے۔ بشیر الدین ایک طالب علم تیرہ نمبر کے قریب میں رہتے تھے اونکے دوست کالج میں داخلے کو آئے ایک صاحب کہتے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ یہہ نیا شخص ہے اسکو بنانا چاہئی وہ حضرت بھی قوم کے دردمین یہاں آئے تھے مقرر بھی تھے شاعر بھی اور علی گڈھ کی زندگی سے واقف اور عبدالواحد بیچارے خود اپنی سائڈ میں تختہ مشق تھے انہوں نے یعنے نووارد صاحب نے جن کا نام سراج الحسن ترمذی تھا خود انکو بنا ڈالا واحد صاحب رات کو فاختہ اوڑانے کا نوٹس چند ساتھیوں کو دے آئے کہ دیکھنا آج کیا فاختہ اوڑاتا ہوں ادہر یہہ فاختہ اوڑانے اس دہج سے چلے کہ سوائے نیکر کے کوئی کپڑا بدن پر نہیں انکا اپنے پلنگ سے جانا تھا کہ نووارد اور انکے دوستوں نے انکا بستر درخت پر پہونچا دیا رات جب زیادہ گئی تو ایک دور کے درخت کے اونچی شاخوں میں اسکو چھپا دیا جو دوسری رات کو نظر آتش ہوگیا اور بھوت کا کرشمہ سمجھا گیا۔

اکٹوبر میں اسکول اور کالج درگا پوجا کی تعطیل یعنے دسہرے کے بعد کھلتا تھا اور یہ ہی زمانہ عام طور سے داخلہ کا ہوا کرتا تھا پرنسپل صاحب اور میر ولایت حسین صاحب کے کمرے کے سامنے ایک مجمع جمع رہتا تھا جب کثرت سے طلبا ایک دو دن میں آجائیں تو

اسکو اصطلاح میں راج گھاٹ ٹوٹنا کہتے تھے۔ ہماری ٹولی نئے طلبا کی مدد اس طرح سے کرتی تھی کہ بعض وقت تو اسٹیشن ہی سے نو وارد کو کیک لیتے تھے بعض وقت پھاٹک سے اپنے کمروں پر بطور مہمان کے لے آتے تھے۔ انکو داخل کراکر رسل گنج سے معمولی فرنیچر اور پلنگ نقد یا ادھار جیسی صورت ہو دلا دیا کرتے تھے۔ نئے آنیوالے ہماری اس قومی ہمدردی سے بہت متاثر ہوتے تھے اور انہیں معلوم بھی نہ ہوتا تھا کہ یہ زحمتیں الیکشن لڑانے کی تیاری کے ذیل میں ہوتی ہیں اسے لوگ یونین کے الیکشن میں ہم ہی لوگوں کی بات مانتے تھے اور الیکشن وہ ہی جیتا تھا جسکے ساتھ ہم لوگ ہوں اور بلا کسی سال پسپائی کے یہ ریکارڈ ہماری ٹولی کے آخری سالار یوسف قمرالدین مرحوم کے وقت تک قایم رہا یعنے اورنگ زیب خاں صاحب کے الیکشن تک جو اب سرحد کے مسلمانوں کے ناخدا ہیں۔

یہ ہی زمانہ مرے صاحب کے آنیکا ہوا کرتا تھا اونکی آمد کے لئے جاڑے کا زمانہ موزوں تھا اس لئے کہ لوگ اپنے گھروں سے اس زمانے میں آتے تھے جیب گرم رہتی تھی۔ لوس مکھن، سگریٹ خرید سکتے تھے اور حلوے وغیرہ گھروں سے ساتھ لاتے تھے۔ پہلے زمانہ میں مرے صاحب خاص اہتمام سے آیا کرتے تھے۔ بعض اوقات مرے صاحب کا پورا بھیس بنایا جاتا تھا جو نہایت ڈراؤنا ہوتا تھا چنانچہ ایک دو مرتبہ لڑکوں کا ڈر کے مارے

پیشاب تک خطا ہو گیا۔ جاڑوں کا ذکر ہے ہمکو مارلین کورٹ میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ
بھی نہ ہوا تھا کہ ہماری ٹولی نے پکی بارگ پر جوابی حملہ کرنا چاہا۔ اور بڑی زور و شور سے اسکی
تیاریاں ہوئیں کسی نے خوب کہا ہے۔

بہڑا پے کی دانائیاں لیکے کوئی | دلا دے وہ بچپن کی نادانیاں

۱۹۰۱ کا واقعہ ہم آج ۱۹۴۴ء میں لکھ رہے ہیں جبکہ

نغمہ بھی کوئی وجد میں لاتا نہیں اب | کیسا ہی مزا ہو دلکو بھاتا نہیں اب
اللہ اللہ یہ وقت بھی آپہونچا | پیاری صورت پہ پیار آتا نہیں اب

لوگ پسے گئے۔ مرے صاحب کا مکالمہ تیار ہوا چونکہ وہ انگریز تھے اسلئے گفتگو
انگریزی میں کرتے تھے یہ لارڈ لیک کے فوج میں سے تھے جو علیگڑھ کے قلعہ کی مہم میں
کام آئے انکی روح مصری تماکو کے بنے ہوئے سگریٹ اور ڈبہ کے مکھن کیلئے بیتاب
رہتی ہے یہ خود تو سوائے سگریٹ اور مکھن و بسکٹ کے کچھ نہیں لیتے مگر ان کا مزاجو
انکے ساتھ ہوا کرتا ہے نقد پیسے بھی لے لیتا ہے۔ غرض ایک ڈھیلا ڈھالا سوٹ ایک ٹوپی
ہوی ٹوپی تلاش کیگئی شہر سے جلانے کی اسپرٹ کے شیشے منگائے گئے اور بیرے
کا منھ کالا کرنے کے لئے کوئلے پیسے گئے۔ غرض بڑے اہتمام سے اس حملے کی تیاری

ہوئی، شاندار پسپائی یا عقلمندانہ واپسی کے طریقہ سوچے گئے۔ راستہ میں سے سامان یعنے خالی پیالی پرانا سوٹ ٹوپی وغیرہ لیکر بھاگنے کے لئے پہلے سے کمک کھڑی کر دی گئی غرضکہ گیارہ بجے کے بعد ایک ایک کر کے ماریس کورٹ کے باہر جانا شروع ہوئے تین آدمی یعنے مسٹر مرے اُٹھا کتا اور نوکر سجائے گئے مرے صاحب نے ایک ڈھیلا ڈھالا سوٹ زیب تن کیا ایک پرانا شو پہنا اور سر پر انگریزی بوسیدہ ٹوپی اوڑھی۔ انکے برے صاحب نے صاف شفاف ہندوستانی کپڑے پہنے اور ہاتھ منہ کالا کر کے دونوں ہاتھ میں دو دوسرے اسپرٹ کے پیالے لئے۔ تعاقب کی صورت میں مغالطہ دینے اور سامان وغیرہ اوٹھانے کے لئے جہاں تہاں چار پانچ لوگ اور کھڑے ہو گئے کہ بجائے مرے صاحب کے تعاقب کے انکی طرف متوجہ ہو جائیں اور یہ تازہ دم بھاگنا شروع کر کے توجہ اپنی طرف کرلیں اور دوسرے راستہ پر پڑ جائیں چنانچہ مرے صاحب نے کچی بارگ کی پشت کے سلاخوں کے سامنے آ کھڑے ہوئے وہ ہنس کر ٹال گئے اور کتے نے اُچک کر سلاخوں تک جست کی۔ شاباش شاباش کی آواز آئی اور مرے صاحب آگے بڑھے شبہ ایسا ہوتا ہے کہ تو وس ایبر والے اس راز سے واقف ہو چکے تھے اور وہاں تین چار صاحب جنکو طاقت کا گھمنڈ تھا جمع تھے مگر اس طرف کا بیرا بھی قوت میں کسی سے کم نہ تھا بلائے مدراس آل راونڈ اسپورٹ ہیں۔

میرے صاحب کو بھی فٹ بال والے خوب جانتے ہو گئے۔ کتے نے تو اپنے آپ کو خود پیش
کیا تھا اسکول کے اچھے کودنے بھاگنے والوں میں سے تھے اور کوتاہ قد غرض جیسا وقت آ کے
کمرے پر چسپت کر کے کتے نے اپنے آقا کی آمد کا اعلان کیا تو لوگ سڑک کی طرف متوجہ ہوئے۔
میرے صاحب نے اپنی المناک داستان بیان کی کمرے کی سیخ نکالنے کی کوشش ہوتے ہوئے
دیکھکر میرے صاحب بجائے اسکے کہ بھاگیں سگریٹ جلا کر جلتی دیا سلائی بیرے کے ہاتھ میں جو
کٹورا تھا اس میں ڈال دی ایک دم سے شعلہ اٹھا اور پہلوان صاحب کہاں تو باہر نکل رہے تھے
کہاں ڈراونی آواز نکال کر اپنے یاروں پر گرے اور ڈر کے مارے حواس باختہ ہو گئے جو لوگ
اس کمرے میں تھے کہتے تھے کہ بیچ میں بیرے کی سیاہ صورت اور اسکے دونوں طرف شعلہ بھڑکتے
ہوئے دیکھ کر سب پریشان ہو گئے تھے بہرحال پہلوان صاحب کے بے ہوش ہو جانے کی وجہ
سے بھاگم دوڑ پڑی اور یہہ جماعت اپنا مشن پہلے ہی حملہ میں پورا کر کے واپس لوٹی اور صبح
کو ڈیکی نامہ لکھانے کے لئے بچارے رک گئے اور ادھر ہمارے نامہربان سب پراکٹر صاحب
نے تحقیقات کرنا شروع کر دی سب چیزوں کے غائب کرانے کا تو پہلے انتظام ہو چکا تھا
مگر ایک کمرے کے اندر کوئلہ پیسنے کے داغ رہ گئے تھے وہ پکڑ گئے مگر کمرے والوں نے
سوائے اسکے کہ ہم نے سنجن کے لئے کوئلہ پیسا تھا کوئی جواب نہیں دیا نتیجہ کا انتظار ہے

کمرے میں ظاہر ہوا ۔ بڑے صاحب اور مرے صاحب صاف بچ گئے ۔ مرزا اُنکے
کم عمر حوارین کو ملی جو اس کمرے میں رہتے تھے اس کے بعد کبھی اس شان کے ساتھ مرے صاحب
نہیں آئے البتہ درختوں پر سے آگ اکثر گرتی رہی ۔ پکی بارگ کے یہ تیس مار خاں صاحب
پھر بلا لائینس رات کو اسٹیج تک کو نہ نکلے ۔ گانے بجانے کا بھی یہی زمانہ تھا ۔ اگرچہ
گانا بجانا تھیٹر ناٹک اسلام میں جائز نہیں لیکن سرسید نے سب سے پہلے یہہ بدعت
کی یا کفر توڑا ۔ اونہوں نے اسٹیج پر آکر ایک غزل گائی جس میں فی البدیہہ اس شعر کا
اضافہ کر دیا ۔

قوم ما اے قوم ما کز بہر تو   دادہ ام بر باد ننگ و نام را

مرزا قسیم بیگ صاحب چغتائی یہہ قصہ بیان کرتے تھے کہ بورڈنگ ہوس
کی نگرانی نواب وقار الملک بہادر مرحوم کے سپرد تھی اور طلباء نے اندر سبھا کا تماشہ
کرنا چاہا اوسکے زور شور سے ری ہرسل ہو رہی تھی ایک رات کو نواب صاحب مرحوم آپہونچے
اُنکے آنے کی آہٹ پا کر اور لوگ تو ادہر اودہر ہو گئے مگر مرزا صاحب راجہ اندر بنے کرسی
پر بیٹھے تھے یہ اوٹھ نہ سکے اور نواب صاحب نے فرمایا کہ کون ہے انہوں نے جواب
میں اپنا پارٹ شروع کر دیا کہ ۔

راجہ ہوں میں قوم کا اندر میرا نام　　بن پریوں کے دید کے نہیں مجھے آرام

غرض معاملہ سرسید تک پہونچا اور مرزا صاحب کا جواب یہ تھا کہ آہ میں نواب صاحب کو پہچان نہیں سکا۔ آواز سے اور نہ صورت سے اس لئے کہ اندھیرا تھا باوجود نواب وقار الملک مرحوم کے مخالفت کئے ایسے ڈرامے جس میں عورت کا پارٹ بھی کیا جاتا تھا ہوتے رہے۔ لیکن نواب صاحب جب محسن الملک کے وفات کے بعد سکرٹری ہوئے اسوقت انہوں نے زنانے پارٹ کی یک لخت ممانعت کر دی اور سالانہ ڈراما چھوڑ دینا پڑا۔ حالانکہ نظایر کثیر اس مادہ میں تھے سرسید اور محسن الملک دونوں کے زمانے کے اور مارسین صاحب تو کلکتہ سے انگریزی کمپنی ایک دن کے لئے لائے تھے کہ لڑکے دیکھیں انگریزی اور دیسی ناٹکوں کا فرق ٹون ہال میں یہ کھیل ہوا تھا اور نواب محسن الملک بہادر نے تھیٹر کے اوپر ایک بڑا زوردار مضمون لکھا تھا سالانہ ڈرامے کے لئے عموماً شکسپیر کے ڈراموں میں سے چنا جاتا تھا۔ اور اسمیں سید عین الدین اور عبدالرحمن سندہی، خاصہ خراج تحسین انگریز عہدہ داران و پروفیسران ہی سے نہیں بلکہ انکی میم صاحبوں سے بھی حاصل کر چکے تھے۔ حسن محمد حیات شہرت کے زینہ پر آ ہی رہے تھے کہ یہ افتاد پڑ گئی۔ خیر اس سال تو انگریزی ڈراما چھوڑ ایک مشاعرے اور شادی کے نقل کی اجازت مل گئی۔ منظور نے

اقبال کا ترانہ اور فضل الہیٰ نے بھرویں عجب ادائیں اس شوخ سیم تن میں لگا کر حاضرین کو لٹا لٹا دیا اور اس خاکسار اور عزیز اللہ گورکھپوری نے محفل کو خوب گرما یا۔ اسکے بعد پھر دوسرے سال سے ڈراما کا نام نہیں لیا البتہ سالانہ ڈنر کے بعد جب سب تقریریں ختم ہوجاتیں تو مسعود ناجی نظم نثر۔ انگریزی، فارسی، اردو حسب موقع بولکر اپنی چٹپٹی مٹک سے کچھہ سامان ظرافت مہیا کردیا کرتے تھے۔ کورس وغیرہ کا سلسلہ قایم رہا۔ شرعی ممانعت اور اس سختیوں کے بعد بھی فنِ موسیقی کے متعلق علی گڑھ کے سامنے + نہیں آلا جا سکتا منظور رضے تو خاصہ نام پیدا کیا سرور بھی کچھہ گن گنا لیتے تھے لیکن عبد الباقی، علی حسین استاد، حلیم، فضل الہیٰ جو بعد کو نواب صاحب بھاسو کے پرائیویٹ سکریٹری ہوگئے۔ تال سُر سے کافی واقفیت رکھتے تھے اور محمد احمد صاحب نے تو ایسے فن کو حیثیت سے حاصل کیا اور اہل کمال سے ہیں چونکہ شِشَن جج تھے اس لئے اونکے جشن اونکے خاص احباب کی حد تک محدود رہے وہ بھی سال میں کبھی کبھی۔

اسکول میں دس برس کے عمر سے لیکر اساتذہ کی عمر تک کے طالب علم تھے مثلاً شفقت حسین۔ احمد حسین خاں۔ عبد الصمد۔ سید احمد۔ کنور شبیر علیخاں، کنور محفوظ علیخاں وغیرہ اور بچوں میں مسعود الحسن۔ عبد الباری اور چند ظہور حسین وارثیں۔

اول الذکر اصحاب کامیابی کے انتظار میں اسکول میں برسیں گزار کر چلے گئے تھے۔ شفقت الیف، اے تک کالج میں پانچ سات برس اور چلے پھر وہ بھی تحصیلدار ہوگئے۔ اتفاق کے کپتانی میں اسکول ٹیم کی قسمت پھر جاگی۔ اور اونکی کوششیں بار آور ہوئیں، نوابصاحب بھوپال کی آمد سے جو اُس زمانہ میں صاحبزادے حمید اللہ خاں صاحب کہلاتے تھے۔ اسکول کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ صاحبزادے صاحب تھوڑے ہی عرصہ میں گھل مل گئے۔ جن لوگوں سے وہ ملے انکے دل میں اونکی محبت جگہہ کر گئی۔ جنھوں نے اونھیں دور سے دیکھا انکو وہ مغرور اور خوشامد پسند نظر نہیں آئے اونھوں نے اپنی ذاتی وقار کی قربانی کئے بغیر ہر شخص سے ملنے کا موقع حاصل کیا اور جسسے ملے اسکو اپنا مداح بنا لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیڈری کا جوہر انکی خلقت میں موجود تھا اور اپنا لینے کی قوت قدرت نے انہیں خاص طور سے عطا کی ہے۔

علیگڑھ میں اونکے مداح اور انکے پیرو انکی ثروت و دولت کی وجہ سے نہیں ہوے۔ اونکا دسترخوان وسیع تھا مگر چند مخصوص احباب تک علیگڑھ والے انکو پرنس کہتے تھے۔ حقیقت میں انکی کامیابی کا راز انکی شخصیت میں تھا وہ جسکی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے تو اسطرح سے بڑھاتے تھے کہ اسکو کمتری کا احساس نہیں ہوتا تھا کھیل کا

میدان ہو یا پڑھائی کا کمرہ وہ اپنے ساتھیوں کو یہ محسوس نہ ہونے دیتے تھے کہ ان میں اور دوسروں میں دنیا کے دستور نے کتنی بڑی خلیج حائل کر رکھی ہے کالج میں جو ہردل عزیزی اونھوں نے حاصل کی وہ محض انکی شخصیت کی بناء پر تھی جس میں ذاتی کردار کے سوا، کسی اور چیز کو دخل نہ تھا۔ اس زمانے میں شخصیتیں ایسے موجود تھیں جنکو اپنی پیدائشی حق پر بڑا ناز تھا۔ پرنس کے طرز و روش نے ایسے لوگوں کے عیوب اس بری طرح سے ظاہر کئے کہ ان لوگوں کو خود کبر و تکبر کے آئینہ میں اپنی بھیانک شکل نظر آنے لگی اور اسطرح سے بہت سے گم کردہ راہ اسلامی اخوت کے راستہ پر آ گئے وہ اپنے دوستوں کی امداد کرتے تھے غریبوں کی مدد کرتے تھے۔ مگر ایک دوست کی حیثیت سے ایک ہمدرد کی طریقہ پر۔ علی گڑھ کی زندگی میں اونھوں نے ایک نئی روح پھونکی مختلف پارٹیوں میں سمجھوتا کرانے کی ہمیشہ کوشش کی لیکن کبھی بیجا دباؤ نہیں ڈالا انکی کامیابی کا سب میں بڑا راز یہ ہے کہ شروع سے ہٹ اور زوال میں تمام کو نہیں تھی اور کالج کے معاملات میں کردم وشدا انکی پالیسی نہیں رہی۔ علی گڑھ پارٹی میں جو درجہ اونھیں حاصل ہوا وہ اس سے پہلے نہ کسی کو حاصل ہوا تھا نہ انکے بعد کسی کو حاصل ہونیکی اُمید ہے انکی فیاضیاں زبان زد خاص و عام ہیں لیکن اونکی محبت کی گہرائیاں کہیں

وسیع تر ہیں۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمۂ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

پرنس کی زیرک و دانائی کی ایک ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ اونھوں نے وقت
واحد میں کالج کے ہر شعبے میں حصہ نہیں لیا سب سے پہلے اونھوں نے کرکٹ کی طرف
توجہ کی دنیا کو معلوم ہے کہ وہ پولو کے بڑے مشہور نامور کھلاڑی ہیں علیگڈھ میں وہ
اگر چاہتے تو ایک پولو ٹیم بنا سکتے تھے لیکن اونھوں نے کالج کا مفاد کرکٹ کو دوبارہ
زندہ کرنے میں دیکھا اسکول ہی سے اونھوں نے خاص دلچسپی کا اظہار کیا اور خود
اسکول کے کچھ لڑکوں کی ایک ٹیم بنائی۔ اسکو کالج یا اسکول سے تعلق نہ تھا۔ نئے
کھلاڑی پیدا کرنے میں چھتاری کا بھی حصہ ہے نواب صاحب چھتاری جو اسوقت
کنور احمد سعید خاں تھے اور اپنے خاص احباب میں حافظ جی کے نام سے یاد کئے
جاتے اونھوں نے بھی اسکول کے اور کچھ باہر کے لڑکے لئے یہ دونوں ٹیمیں اکثر
کیا ہر دوسرے تیسرے ہفتہ ریٹرن میچ کھیلا کرتی تھیں کھیل کے علاوہ لنچ بازی
ہوا کرتی تھی اور دونوں طرف کے کھلاڑیوں کو عمدہ عمدہ کھانے ملا کرتے تھے۔
جاڑوں میں ایک دو مرتبہ تو چھتاری مین بھی کھیلنے پہونچا کرتے تھے۔ کچھ کرکٹ

کھیلتے تھے اب معلوم نہیں کہ کوئی گرونڈ تیار کر لیا ہو اس زمانے میں تو کوٹھی کے دوسری طرف پھلوں کے درختوں کا ایک تختہ کٹوا کر صاف کر لیا تھا اور بیچ میں مچ بنائی تھی اس کوٹھی کے سامنے کی طرف ایک پر فضا لان تھی اور زمین سے ملے ہوئے گھومنے والے فوارے چلتے تھے یہ مقام بہت ہی بھلا معلوم ہوتا تھا کچھ لڑکے بطوں کے شکار کو چلے جاتے تھے اور کچھ بٹیریں پکڑنے بٹیروں کا جال لیکر ادھر کے کھیتوں میں چلے جاتے تھے لڑکے تو پانچ سات ہی بٹیریں پکڑ کر لاتے تھے مگر منیر پراونکی آٹھ گنی دس گنی ہو جاتی تھیں، غرض ایک رات اور دو دن بڑے مزے میں کٹتے تھے۔ مجھے بھی ایک دو مرتبہ اتفاق ہوا۔ اس لان پر بڑے بڑے گھنٹوں ہم اور حیات آسمان زمین کے قلابے ملایا کرتے تھے۔ یہ کوٹھی ایک گڑھی میں واقع تھی گڑھی میں آتے ہی ایک مسجد تھی جس میں جو مسافر رات کو رہجائے اسکو کھانا انہیں کے گھر سے دیا جاتا تھا کنور صاحب کے دادا صاحب اور لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے مذہب کے پورے پابند تھے اگرچہ بڑے زمیندار تھے اور زمیندار کا کام بغیر اوگائی بٹائی میں حصے کے نہیں چلتا۔ بہت سے مسلمان گھرانے من بھر پیچھے دیکر سوا من غلہ فصل پر لینا جائز قرار دیچکے تھے لیکن ان کے یہاں ع‍ســہ کے م‍ســہ فصل پر لینا

گناہ تھا سود دیا غلہ بھی۔ نقد جتنے کے عوض او تنے مگر رومال کی قیمت میں جملہ سود آجانا
بھی انکا دستور نہ تھا۔ اس پر بھی وہ قرض بلا سود۔ وفی سبیل اللہ دو توں طرح سے اکثر اہل غرض
اور قابلِ مدد اشخاص کو دیدیا کرتے تھے۔ اور یہ سب عمل خاموشی کے ساتھ مسجد میں
ہوجایا کرتا تھا۔ مرحوم ومغفور کے زہد وتقویٰ کا اور اس امر کا کہ اس خاندان میں اسلامی
تعلیم کہاں تک رگ رگ میں سرایت کرگئی تھی قصہ یوں کہا جاتا ہے کہ ایک صاحب کو
ترک وطن ہی میں مفر نظر آیا انکے معاملات کچھ ایسے پیچیدہ ہوگئے کہ آبرو بچا گھر میں
رہکر محال تھا وہ مرحوم کے پاس پہونچے اور اپنی جائداد اونکے حوالے کرکے چند ہزار
کی خواہش کی جو پوری کردی گئی۔ قرار یہ پایا تھا کہ یہ رقم جائداد کی آمدنی سے ادا ہوجائے
گی۔ جب زمانہ انکے لوٹنے کے موافق ہوا اور یہ لوٹیں تو جائداد انکو واپس ملجائے
برس گزرا دو برس گزرے دس برس کے بعد کہیں انکو آنا نصیب ہوا یہ صاحب قسمت
آزمانے کو مسجد میں پہونچے اور کہا میں فلاں صاحب ہوں یہہ سنتے ہی مرحوم ومغفور
اوٹھ کھڑے ہوئے اور مسجد سے چلدئے ایسی روا نگی اس سے پہلے نہ ہوی تھی انہیں
بھی اپنے آنے پر افسوس ہوا مصلیوں میں بھی چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ یہہ ایک روز
اور ٹھیرے حسب معمول کھانا آتا رہا۔ مگر مرحوم نہیں آئے پھر اور مصلیوں میں چہ می گوئیاں

بڑہیں کہ بھائی سو دو سو ہزار یا پانچسو کی ادہ بات ہے اور پورے بارہ برس کا منافعہ اور بات ہے دل پر جبر کر کے یہہ صاحب ایک دن اور پھیرے دوسرے دن داخل خارج کی درخواست کی نقل اور تحصیلدار کا حکم معہ جملہ حساب کے انکے ہاتھ میں تھا اور کان یہہ سن رہے تھے کہ "رقم زیادہ ہے جس جگہ کہو حفاظت سے بھجوا دوں"۔ یہ ہے اعلی زہد جسکو زن، زر، زمین نہ پھسلا سکے۔ ایسے بزرگوں کا فیض ہے کہ آج کنور احمد سعید خاں۔ ہز اکسلنسی ڈاکٹر کرنل نواب سر حافظ احمد سعید خاں ہیں اور ایسی ہی بزرگوں کی دعائیں انکی حفاظت کی ضامن ہیں۔ صاحب موصوف کے قد و قامت کو دیکھتے ہوئے ہر شخص سمجھ لیگا کہ انکے مونچھ ڈاڑہی ہی نہیں بلکہ جوانی بھی جلد آئی ہوگی۔ ماشاء اللہ جوان بھی جلد ہوئے اور خود مختار بھی۔ جن لوگوں نے اس زمانے کی علیگڈہ و بلند شہر کی نمائش اور میرٹھ کی نوچندی دیکھی ہیں اور ان اضلاع کے بعض رؤساء کی زندگی اور ریاست کے شان و لوازمات دیکھے ہیں وہی کچھہ ان کے نفس کشی اور اور اعلیٰ اخلاقی معیار کی داد دے سکیں گے۔ کتنی بشاشت ہوگی جنت میں دادا کی روح جب وہ اپنے پوتے کو گورنمنٹ ہوس میں احکام الٰہی کی تعمیل میں قبلہ رخ سر جھکائے ہوے دیکھتی ہوگی۔

الحاصل جسوقت پرنس نے علیگڑھ ٹیم کی کپتانی میں چار چاند لگائے اسوقت تک وہ ایک ایسے ٹیم تیار کر چکے تھے۔ جو انکی شایاں شان تھی۔ نواب صاحب و کرکٹ کلب کا تذکرہ علحدہ ہوگا۔

اسی موسم میں لڑکوں کے مکان سے مختلف حلوے وغیرہ آتے تھے اور یہ جانچنے کا موقع ملتا تھا کہ تنہا خوری کن کن کا شیوہ ہے اور انکو درست کرنے کے لئے کتنی چاشنی کی ضرورت ہے علیگڑھ کو ہمیشہ اس پر فخر رہا ہے۔ کہ اسے کلیا میں گڑ پھوڑ تا نہیں آتا۔ جو راز ہے وہ تشت از بام جو کھیل ہے وہ سامنے سارے کھلے پتے میز پر۔ یہ کیوں کر روا رکھا جا سکتا کہ چند اشخاص کے چورا چوری اسطرح کی چکنائی دوسروں کو بھی خراب کرے پس ضرورت تھی اور قومی ضرورت کہ انکے اس نقص کو نکالا جاتا اور اسکی یہ ہی ترکیب ہو سکتی تھی کہ بھائی تم نے کافی زحمت اس حلوے کو چھپا کے رکھنے میں اٹھائی ہے تمنے کافی لذت دوسروں کو اس لذت سے محروم کرنے میں حاصل کی اب مرتبان دیکھ کر پڑے رہے جاؤ۔

یا مظہر العجائب حلوا معہ چچہ غائب۔

جو لوگ اپنے احباب کو اپنا ہمنوالہ و ہم پیالہ بنائے رہتے تھے وہ ان

تنہا خوروں سے کہیں اچھے رہتے تھے کیونکہ جب ایسے اشیائے خوردنی آتے تھے تو ایک عام اطلاع احباب کو دیدی جاتی تھی کہ آؤ اور کھا جاؤ صبح پارسل آیا شام تک غائب پھر دوسرے دن کی فکر نہیں بالکل توکل پر معاملہ رہتا تھا کہ کھایا اور کھلایا ہاتھ پونچھ علٰحدہ ہوگئے۔ بعضے لڑکے تو ایسے بھونڈے پن سے چیز چھپاتے تھے کہ معاذ اللہ مثلاً ایک صاحب بڑے گھرانے کے کالج میں آئے اور عمدہ مرشدآباد کے آم ساتھ لائے اور اپنے کپڑوں کے صندوق میں رکھ دیئے میں نے کلاس سے نکلتے ہوئے اونکو آلیا اور سوال کیا کہ یار مرشد آباد میں آم کا عطر سنا ہے اچھا نکلتا ہے مجھے دیکھکر ہنسنے لگے گویا کہ میں سخت بیوقوف ہوں ایک دوسرے صاحب نے انکی بغل کے طرف منھ بڑھا کر کہا کہ ہاں بھائی یہ تو عطر آم ہی کا۔ اُسی شام کو عباس ایک تار انکے پاس لیکر آتا ہے کہ یار گھر سے آم آگئے ہیں چلتے ہوئے اسٹیشن پر آج رات کو انہوں نے انکار کردیا ان صاحب کے صندوق میں سے آم پالش کے ٹوکرے میں منتقل ہوئے اور وہ ٹوکرا انہیں کے سامنے لاکے رکھا گیا کہ مرشد آباد سے آیا ہے اور خوب خوب آم کھائے گئے اور یہ صاحب بھی مزے مزے سے کھاتے رہے دوسرے دن جب انھوں نے صندوق کھولا تو وہاں آم کہاں تھے یہ ہمارے ہی روم فیلو تھے۔

اس کے بعد پھر جب کبھی بھی لکھنو یا مرشد آباد سے انکے پاس کوئی چیز آتی تو پہلے ہی سے طے کر لیا کرتے تھے کہ کس کس کو قبل از وقت مطلع کر دینا چاہیئے۔ جاڑوں کے زمانے میں مختلف قسم کے حلوے جس میں اکثر و بیشتر گاجر کا حلوہ ہوتا تھا زیادہ تر ان کے پاس آتے تھے یا وہ لوگ ساتھ لاتے تھے جو یوپی کے تھے۔ اور خصوصاً لکھنو و دہلی کے انکو مختلف طریقوں سے چھپا کر بعض حضرات رکھتے تھے۔ اور طرح طرح کے بہانے بنایا کرتے تھے۔

مانا کہ داغ ایک ہی عیار ہے مگر
دشمن بھی تو بیٹھے ہوئے سارے جہاں کے ہیں

چلانے والے پتہ چلا ہی لیتے تھے۔ اور جس طرح سے عشق اکثر گفتار سے بھی بلا دیدار کے پیدا ہو جاتا ہے۔ مرغن غذاؤں کا پتہ بے محل گفتگو اور بیجا احتیاط سے چل جاتا تھا۔ بمصداق چور کے گھر میں مور خود ہمارے ہر وقت کے ساتھ اوٹھتے بیٹھتے کھانے پینے والوں میں ایک صاحب ایسے نکلے جنکی بدولت سابقہ محنتوں پر پانی پھر گیا بلکہ ناک کٹتے کٹتے بچ گئی۔ ان سے یہ حرکت اگر پہلے سال میں سرزد ہوئی ہوتی تو قابل معافی تھی مگر سکنڈ ایر کے دوران میں تو گناہ عظیم ہی تھا

روایات قدیم کی خلاف تھی۔ گلاوٹی والے احمد علی جو بعد کو کرکٹ کپتان بھی ہوئے
شیخ احمد حسین۔ راقم الحروف اور یہہ صاحب بڑے دن کی چھٹیوں کے بعد اٹاوے
سے چلے ایک دن پہلے قرار پایا کہ کون کون کیا کیا اشیاء خوردنی لے چلے، چنانچہ
ان صاحب نے بجز معتزیات کا حلوہ اپنی مرضی سے اپنے ذمہ لیا۔ انڈوں کا حلوہ
احمد علی کے سر پڑا۔ احمد حسین نے گاجر کے حلوے کا وعدہ کیا اور انہیں مسیحائی روزگار
نے مجھسے سلاجیت کی کھیر کی فرمایش کی احمد علی کی موجودگی اور استاد حلیم کی کیتھائی
کہنا ہی پڑا کہ اچھا صاحب سلاجیت کی کھیر۔ اٹاوے میں ہم سب کے ایک مستقل دوست
تھے اسلامیہ اسکول اٹاوے میں تمام بچپن اور جوانی انہوں نے چھٹویں درجہ تک
پہونچنے میں کاٹ دی تھی، علی حسن صاحب کے زمانے میں جب وہ اسکول میں تھے
کرکٹ کھیلنا شروع کیا تھا۔ ظفر عمر صاحب اور عبد الوہاب کے ہم سبق تھے۔ محمد محسن
اور محمد مستحسن کی خدمت میں بھی انہیں نیاز حاصل رہتا ہے اور جب ہم لوگوں سے
انسے دوستی ہوئی تو بمصداق ۔

میں تو ابھی جوان ہوں چرخ ہوا کرے کہن

خود کو بیس بائیس سے زیادہ عمر کا نہ سمجھتے تھے آواز اچھی تھی راگ نی سے واقف تھے

دوست پرست اور حاضر باش تھے مگر علی گڑھ تفریحاً بھی آنے گھبراتے تھے۔ کبھی نائینی
تک میں نہیں آئے یار شاطر تھے کبھی بار خاطر نہ ہوئے انہوں نے چھ روپیہ نقد اور دس
سیر دودھ لیکر یہ بلا ہمارے سر سے ٹالی صبح کو ایک ہانڈی بھر کر لائے اور کہنے لگے کہ
لو میر صاحب کیا یاد کروگے رات بھر سلاجیت ڈالکر دودھ کو گھونٹا ہے۔

ہم لوگوں کا سفر بھی ایک خاص رنگ کا ہوتا تھا یوروڈنگ چھوڑتے وقت
تو پھاٹک سے بستر سے لوٹنا ایک کھیل تھا البتہ واپسی میں اس بات کی کوشش کرتے
تھے کہ سب یار غار راستے میں ملتے ہوئے چلے جائیں اس لئے میل ٹرین سے تو بڑی
چھٹیوں اور ڈسمبر کی چھٹیوں میں سفر کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی
تھی کہ میل ٹرین سے نصف ٹکٹ کے رعایت نہ ہوتی تھی غرضکہ اس مرتبہ بھی جب
ٹرین اٹاوہ اسٹیشن پر پہونچی تو انٹر کلاس ہم لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ اعظم گڈھ۔
محمد آباد کے ظہیر الدین، محی الدین اور ضمیر الدین۔ مثلواثمہ الہ آباد کے نبی اللہ اور
دو صاحب ـــ کانپور پر استاد حسیلم ودولی کے عنایت الرحمن وغیرہ بھی لکھنو
کی طرف سے آئے تھے۔ غرضکہ بنارس اور مرزاپور تک کے احباب ہمارے
انتظار میں تھے۔ کہ کب اٹاوہ آئے اور کب ہم ملیں۔ ریل آئی ہم لوگ بیٹھ

سامان رکھا گیا۔ جو دوست ہم کو رخصت کرنے آئے تھے ان میں سے چند پرانے علی گڑھی بھی تھے جن میں سے ایک ہمارے چچازاد بھائی تھے یہہ کالج میں یعنے اسکول میں تھوڑے دنوں پہلے تک تھے، سعیدالدین ٹھنڈائی انکے گارجین تھے۔ تحقیق انکا نام ہے احمد علی کی انکی بڑی دوستی تھی۔ یوں تو یہ حضرت طرار فرار نہ تھے۔ مگر موقع پر شرارت کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ پلیٹ فارم پر خونچے والوں کی طرح آواز لگانے لگے۔ مرغ کے انڈے گاجر کا حلوا۔ تازے کباب باسی برے۔ سلاجیت کی کھیر سلاجیت کی کھیر۔ ضمیر نے اندر سے کہا آکے دیتا جا خوانچے والے۔ استاد کے کان کھڑے ہوے انکی زبان کیا روکنے والی تھی وہ احمد علی کیطرف متوجہ ہوئے مسیحائی روزگار کی جو شامت آئی فرمانے لگے یہ لیجئے یہ ہے سلاجیت کی کھیر۔ اہیر اُستاد نے چمک کر کہا شاباش میرے گھر کے رئیس۔ پھر تو وہ قہقہہ اوڑا کہ درجہ گونج اٹھا ہمارے دوست کو جیسے سانپ سونگھ گیا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

تلاش معنی بیگانہ در صحیفہ عبث
یگانہ معنی دور از کتاب از من پرس

الغرض گاڑی چلی ضمیر کہتا تھا کہ میں دور سے آرہا ہوں میرا ناشتہ ختم کرو

اور یار تھے کہ سلاجیت کی کھیر کا مذاق اوڑا رہے تھے۔ ریل چلی جا رہی ہے۔ ناشتہ دان کھلے رکھے ہیں کسی کے ہاتھ میں روٹی ہے کسی کے پراٹھا کباب قیمہ ہے ہاتھ کی انگلیاں چمچے کا کام دے رہی ہیں اور کم ہوتی چلی جا رہی ہے سلاجیت کی کھیر ایک دو کا نہیں سب کا ہاتھ رس تک سوائے حلوؤں کے سب ناشتہ ختم۔

اُس زمانے میں نہ جاتے تو کہاں تھا واعظ
دل کو جب ناز تھا قابو سے نکل جانے پر

القصہ پوڑنگ میں پہونچے ایک دو دن میں دو چار دوست احباب جمع ہوئے اور حلوے وغیرہ کا قصہ پاک ہوا۔ حضرت سے جو پوچھا کہ حضرت !! اتنو مقویات نکالو سو کھا منھ بنا کر کہہ دیا کہ کیا کہیں یار والدہ دورے پر تھے والدہ نال گئیں۔ فضل الٰہی نے ایکدن دیکھا کہ بھائی صاحب پلنگ کے سرہانے جھکے ہوئے اپنا صندوق کھول کر کچھہ کہا رہے ہیں اوس نے پوچھا تو کہدیا کہ معجون ہے اوس نے کہا کہ یار پھر تو سا جھا لگاؤ ضعف دماغ کی مجھے بھی شکایت ہے نزلہ پیچھا نہیں چھوڑتا۔ حضرت ایک اوڑان اور اوڑ سے فرمانے لگے نہیں یار ضعف معدہ کی دوا ہے وہ سمجھہ گیا۔ بات ہم لوگوں تک آئی اور بڑی خجالت اوٹھانا پڑی۔ آخر کو کمیٹی بیٹھی

مرتبان میں نیچے راکھ اور مٹی بھر کر ایک موٹی تہ انکے حلوے کی رکھ دی گئی۔ اور باقی اینٹیں کی شرکت میں فضل الٰہی کی طرف سے کھایا گیا۔ دو دن تک تو کچھ خبر نہ ہوی تیسرے دن جب مٹی اور راکھ حلق میں پہونچی تو آنکھیں کھلیں۔ احمد علی ان لوگوں میں سے ہیں جنکی تعلیم شروع ہی سے علی گڑھ میں ہوئی ہم لوگوں کے ہم عمر تھے لیکن مسعود الحسن اور باری سے عمر میں زیادہ یہہ جب کرکٹ کپتان تھے مسعود فٹ بال کے اور نور الدین مرحوم ہاکی کے کپتان تھے ہم سب نے بی۔ اے، ایک ساتھ ہی پاس کیا۔ یہہ دونوں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے اور نور الدین عین جوانی میں داعی اجل کو لبیک کھکے جنت کو سدھارے بچپن کی ملاقات اور روز کا ملنا جلنا تو سب سے تھا مگر مسعود اور نور الدین ایک جان دو قالب تھے۔ نور الدین بورڈنگ میں نہیں رہتے تھے۔ تقریباً انکی تمام عمر تار والے بنگلے میں گزری لیکن بورڈنگ لائف میں انکا ہم میں سے کسی سے کم حصہ نہ تھا انکا لڑکوں پر خاص اثر تھا۔ اونکے مرنے کے بعد ہم لوگوں کے دل کچھ بجھ سے گئے اور یوسف قمر الدین کی موت نے تو بورڈنگ لائف سے ہم لوگوں کے تعلقات ہی ختم کر دیئے۔

یہ سچ ہے کہ کسی کے مرجانے سے دنیا کے کاروبار بند نہیں ہوتا۔ جب مجنوں کے مرنے سے غالب کو جنگل اوداس نظر آتا ہے تو پھر رونق محفل کے اُٹھ جانے سے محفل والوں کو محفل سونی کیوں نہ نظر آئے۔ بعض صورتوں میں تو ایک شخص کی آنکھوں سے

اوجھل ہونے میں نظامِ محفل درہم برہم ہو جاتا ہے۔ علی گڑھ کے حق میں تو ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ مولوی عزیز مرزا صاحب، اور میجر حسن بلگرامی کی موت نے تو کایا پلٹ دی۔ اگر یہ لوگ اس وقت نہ مرتے تو علی گڑھ اور اس کی یونیورسٹی کی تاریخ اور ہی طرح سے لکھی جاتی۔

غم کے جھونکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

سلام الدین صاحب کے بعد لیلائے کرکٹ خلاف توقع عبدالحلیم کے گھر آئی۔ وہ کپتانی سر پڑے کی بیگاری ہی سمجھتے رہے۔ قدرت نے حلیم کی صورت بگاڑ کر قسمت بنا دی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ پانی کا تھپیڑا جدھر لے جائے بہتے چلے جانے کو تیار۔ فکرِ امروز نہ اندیشۂ فردا کا خیال۔ جس صحبت میں پڑ گئے اسی کے رنگ میں رنگ گئے۔ عموماً ایسے لوگ کسی کے دوست نہیں ہوا کرتے۔ مگر ان میں بڑی خوبی یہ تھی کہ خوشی اور غمی دونوں کے ساتھی تھے۔ یہ نہیں کہ دنیا کے نشیب و فراز سے واقف نہ ہوں۔ یا عقلِ سلیم کی کچھ کمی ہو۔ سلام الدین صاحب جس قدر متین تھے اسی قدر یہ ہنسوڑ ے گیند اُلٹے ہاتھ سے پھینکتے تھے تیز اور سیدھی۔ شفقت سے کبھی ٹکر نہیں لی۔ لان سے جب لوٹتے دونوں ہنسی مذاق کرتے۔ ایف۔ اے کا نتیجہ نکلا۔ شفقت اور علی رضا مع بھوندو کے پھر فیل ہوئے۔ شفقت آگرے کو سدھارے اور یہ کمرہ نمبر (۱۳) میں آ براجے

کپتان ہونے سے پہلے اُستادی کے درجہ پر فائز ہو چکے تھے۔ فقرے برجستہ اور چست کہتے تھے۔ لیکچر روم میں مولانا عباس حسین صاحب قبلہ کے جو مقفیٰ عبارت بولنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے ضلع جگت میں منہ آجایا کرتے تھے۔ اُستاد خود اس قصے کے راوی تھے کہ ایک دن قصائد پڑھاتے پڑھاتے کسی شعر میں مرغ سحر کا ذکر آیا۔ توقع تھی کہ آج چوٹیں چلیں گی۔ مگر مولانا نے کچھ دھیان نہیں دیا۔ استاد نے کہا مولانا سال ختم ہونے کو آیا آپ نے ٹینی اور اصیل کا بھی فرق نہیں بتلایا۔ امتحان میں کہیں مرغ زریں سے مرغ قبلہ نما تک آگیا تو۔ دوسری طرف سے آواز آئی یہ ٹاپے ہیں۔ مولانا کیا رُکنے والے تھے کرسی سے اُچک کر بولے بول گیا ظالم۔ پھر تو کلغی سے لیکر خار تک وہ وہ فقرے مولانا نے چست کیے کہ سناٹا چھا گیا۔ کاش ایسے نایاب فقرے ہمارے زمانہ میں سننے میں آتے۔ تو مولانا الیاس برنی کے زینت نوٹ بک ہو کر محفوظ ہو جاتے۔

استاد حلیم بی۔ اے ہوئے، ڈپٹی ہوئے، اور چند سال ہی میں مر گئے۔

کیوں عندلیب تجھ کو یکایک یہ کیا ہوا
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

احمد علی نے بھی کبھی کپتانی کا خیال دل میں نہ آنے دیا تھا۔ البتہ ڈپٹی کلکٹری کی فکر میں رہتے تھے۔ آنکھ ناک کے اچھے تھے، شانے چوڑے، سینہ ابھرا ہوا، گٹھا ہوا بدن مرد میدان تھے، مگر پستہ قد، اور پستہ قد بھی خاصے۔ کاٹھی ایسی مضبوط کہ چودہ برس کے سن ہی میں منہ پر چھریاں

تک تو رہے - انھوں نے از الف تا ے علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی۔ نہ اسکول میں نہ کالج میں
طالب علم سے زیادہ اپنے آپ کو سمجھا یعنے نہ قوم مرحوم کا کالج کی حدود ارضی کے اندر ماتم کیا
نہ قوم کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے کی راہیں نکالیں۔ حتیٰ کہ یونین کے معاملات میں بھی کبھی
دلچسپی نہیں لی۔ خود اور اپنے احباب کلاس چلے جانا، اور کرکٹ کھیلنا، نماز کی حاضری دیتے
ہوئے اپنے کمرہ پر آجانا۔ مذاق بھی کرتے، اور مذاق کی برداشت کی طاقت بھی تھی
ہمارا اُن کا اور احمد حسین کا مغرب کے بعد ملنا لازمی تھا۔ ہماری، ان کی بڑی گہری دوستی
تھی۔ اور یہ اُن چند لوگوں میں تھے، جو ہم کو منا کے نام سے پکارتے تھے۔

ہمارے علی گڑھ میں دو طرح کے دوست تھے، ایک تو وہ جو تر کے میں ایک
دوسرے کو ملنے چلے آرہے، اور ایک وہ جن کو ہم نے خود پیدا کیا تھا۔ یعنے دوستی کا
سلسلہ متروکہ اور مکسوبہ دونوں قسم کا تھا۔ جب ہم پیدا ابھی نہیں ہوئے تھے تو ہمارے
والد علی گڑھ میں پڑھتے تھے، نواب صاحب مرحوم کے دوستوں میں نیاز محمد خاں صاحب
رئیس جالندھر۔ ملک برکت علی خاں صاحب، سردار محمد حیات خاں صاحب۔ پٹیالہ کے
خلیفہ محمد حسین صاحب تھے۔ اس وجہ سے پنجابیوں سے ہم اور ہمارے خاندان کے
طلباء کے بڑے گہرے تعلقات تھے،۔ سید مہدی حسن صاحب یعنے مسعود حسن اور
محمود حسن کے والد کا اور ہم لوگوں کا تو ایک طرح سے ایک ہی کنبہ تھا۔ اور علی گڑھ کی وجہ سے

پچھلے تعلقات اور بڑھ گئے، ان کے یہاں کے لوگ اور ہم ایک جان دو قالب تھے۔ یہی بارگ میں پہلے ہر کمرے میں دو دو طالب علم رہتے تھے۔ اس وقت بھی ہم اور محمود، ایک کمرے میں رہتے، اور ان کے دوسرے عزیز ظہیر اور تقی دوسرے کمرے میں۔ مسعود انگلش ہوس میں تھے۔ جب کالج میں آئے تو اس وقت ایک ایک کمرے میں تین تین طالب ہو گئے تھے۔ اور مسعود بھی ہمارے ساتھ رہنے لگے۔ جب کوئی نیا شخص کمرے میں آتا تو مسعود از راہِ شرارت اُسے آتے ہی کہا کرتے تھے کہ یہ تھرڈ میں ہیں۔

یہی حال میرٹھ والوں کا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ نواب صاحب مرحوم سے، اور ڈپٹی محمد صدیق صاحب مرحوم سے بچپنے کا یارانہ تھا۔ اور نواب صاحب کے چچا فیرزند علی کے اور خان بہادر ممتاز علی خاں کے گہرے تعلقات تھے، ایسے کہ غدر کے بعد خان بہادر اپنے بچوں کے ساتھ اٹاوے ہی آ بسے تھے۔ اس خاندان کے لوگ علی گڑھ میں نواب سیف اللہ خاں صاحب کے گھرانے والے مشہور تھے اور سوپ کمپنی کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ اور ہمارے خاندان والے بھانڈ کمپنی کے نام سے۔ انفرادی حیثیت سے تو سیکڑوں خطاب عطا ہوئے ہیں، لیکن من حیث الخاندان یہ طرۂ امتیاز کوٹھی جنّت نشان والوں، اور سرائے شیخ والوں ہی کو نصیب ہوا۔ اور یہ جب کی بات ہے کہ ہمارا اور امیر احمد کا علی گڑھ میں وجود و بالسعود بھی نہ ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ ہمارے

رشتہ کے ایک چچا نادر حسین صاحب کے فیضانِ عمل کا یہ طفیل تھا۔ ڈپٹی صاحب نے ہمیں بچپن میں ایک شعر یاد کرایا تھا اس میں کا صرف اتنا یاد ہے کہ "ندارم ہیچ کا فرساز و سامانے کہ من وارم" یہ پہلی مصرع یاد ہی نہیں کہ خدا وارم ...... مصطفیٰ وارم" تھا۔

ہاں تو میں احمد علی کا ذکر کر رہا تھا۔ شادی کر دینا، برات اٹھا دینا، جنازہ نکال دینا یورڈنگ میں کوئی بڑا کام نہ تھا۔ مگر انھوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ منگنی رسم۔ دولہا دکھائی سب ہی کر ڈالی۔ ایک دوست ظہیر الدین صاحب اور تھے میانہ قد، نازک بدن ہنس مکھ بے حیا شرم و حیا سے نابلد جیسے سب تھے ویسے ہی خود کو سمجھتے۔ ملاقات میں جھجکتے نہ تھے۔ ان کو شمسی کہتے تھے، اور بہت جلد ہی وہ شمسی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ آفت کے مارے ایک بنگالی صاحب بھی بارگ کے شروع کے نمبروں میں آ گئے، غالباً تھرڈ ایئر میں آ گئے تھے۔ کچھ پیسے کا بھی گھمنڈ تیلاتے تھے، اوروں سے تو بد کتے تھے، مگر ظہیر سے ملنے کے خواہشمند تھے وہ ایک چھٹا ہوا۔ غرض طے ہوا کہ انھیں کچھ دن خراو پر رکھنا چاہیے۔ مغالطہ ویسے تو خود ہی بُرا ہے، مگر حسن کا مغالطہ خدا دشمن کو نہ دے، اور حسن کے مغالطہ کے ساتھ اگر پیسے کا گھمنڈ بھی ہو تو پھر تو اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ ان صاحب میں حسین کہلانے کی کسی صورت سے گنجائش نہ تھی۔ پختہ رنگ، گول چہرہ، ٹھڈی سامنے کی ابھری ہوئی۔ کلّے پھرے ہوئے نیچے کا ہونٹھ کچھ بھاری، بیچ میں ایک لکیر پڑی ہوئی۔ البتہ ناک سلیقہ کی تھی بشرطیکہ چہرا

بیضاوی ہوتا اور ابھرا ہوا نہ ہوتا، آنکھ پپوٹوں سے نکلی پڑتی تھی۔ بال گھونگر والے تھے۔ ظہیر اول تو فورتھ ایئر کا طالب علم، اس پر تیرہ نمبر کا اٹھنے بیٹھنے والا۔ اس نے ذرا ڈھیل جو چھوڑی تو یہ صاحب اتنا کہنے کے گنہگار ہوئے کہ اس سائیڈ میں آپ ہیں بہت پسند ہیں۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا کہ یار بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں، انھوں نے کہا ضرور۔ شمسی نے کہا کہ تم میں کلاسک بیوٹی ہے، صرف رنگ کالا ہے تو وہ بنگال کے لئے نئی چیز نہیں۔ کالی کی پجاریوں میں گورے کہاں سے پیدا ہوں گے۔ بھائی ہوا کا قصور ہے ہوا کا۔ البتہ ذرا چہرہ بشرہ درست کرنا ہوگا۔ میں نے تو تمھاری آنکھوں کے، ناک اور دہانے کے متعلق بیٹ لے لیا ہے۔ کل تیرہ نمبر میں اسی پر مباحثہ ہوگا۔ دو چار دن مذاق کر کے ان کا باپ کاٹا اور کالج کی بڑی چھٹیاں ہوئیں، چھٹیوں میں کلکتہ سے ان کی تصویریں چلی آ رہی ہیں۔

بغیر اس خیال کے کہ پانسہ اُلٹا پڑے گا یا سیدھا شمسی نے شملہ سے ایک اشتہار کامریڈ میں بھجوایا۔ کہ ایک نوجوان پڑھے لکھے حسین مالدار کی ایک حسین لڑکی کیلئے ضرورت ہے خاندانی حالات اور تصویر فلاں پتے سے روانہ کی جائے۔ شمسی کے پاس شملے میں تصویریں آنا شروع ہوئیں، اور مزے دار خط۔ شمسی کی چھٹیاں مزے سے ان خطوں کے جواب دینے میں کٹیں، اور اکتوبر میں جب وہ واپس آئے تو خطوں کا خاصہ پلندہ اور تصویروں کا

ایک مکمل ایلبم ساتھ تھا۔ شملہ سے آتے ہی سب قصہ ماں باپ سے کہا۔ احمد علی نے جو اپنے
بنگالی دوست کی تصویر بھی امیدواروں میں دیکھی، پھر کیا تھا بھڑک اُٹھے اور سیدھے
ان کے پاس پہونچے کہ کیوں یار اکیلے ہی اکیلے شادی۔ انھوں نے بالکل ہی بے تعلقی
ظاہر کی، انھوں نے کہا اچھا دوست ایسی شادی رچی ہو کہ کالج میں اس کا جواب نہ نکلے
رات میں ایک خط ٹائپ ہوا، اور بمبئی کے کسی سوداگر کے لفافے میں رکھ ان کے پاس
بھیجدیا گیا۔ خط احمد علی کے نام تھا۔ کامریڈ کے اشتہار سے لیکر ان کے خط و تصویر کا پورا ذکر اس میں
تھا اور دریافت کیا گیا تھا کہ واقعی یہ کیسے اور کون صاحب ہیں؟ اب تو احمد علی کے پیچھے
پڑ گئے اور اُلٹی خوشامدیں ہونے لگیں۔ ہونے والے دولھا کو بمبئی سے خط وصول ہوا
کہ تصویر کی سند نہیں، شادی بیاہ کا معاملہ ہے آپ خود آئیے اور جائداد کے متعلق ضلع
کے کلکٹر کا سارٹیفکٹ لائیے۔ بمبئی سے علی گڑھ تک کا دو طرفہ اول درجہ کا کرایہ آپ کو
روانہ کیا جائے گا۔ پندرہ دن میں آپ آئیں تیسرے دن احمد علی کے پاس خط آیا کہ شملہ
سے ہمارا ایجنٹ بمبئی آتے ہوئے تمھارے پاس آئے گا تاکہ ہمارے ہونے والے
داماد کے متعلق معلومات حاصل اور رائے قائم کر سکے وہ خط بھی ان کے حوالہ کر دیا گیا
لوگ دیکھ رہے ہیں کہ کمرہ نمبر (۹) سجایا جا رہا ہے اور اِدھر ایجنٹ کی تلاش ہے
اور اس کے لیے عمدہ صندوق، ہولڈال، اور ہینڈ بیگ وغیرہ کی ہے اتنے بڑے

بورڈنگ میں یہ سامان مل جانا کیا بڑی بات تھی غرض کہ بمبئی کی مخصوص مخملی ٹوپی اور
مونچھیں لگا ایجنٹ صاحب آپہونچے، اور احمد علی کے کمرے میں ان کا استقبال
ہوا اور خاصی آؤ بھگت ہوئی۔ ایجنٹ صاحب نے اپنے پارٹ کو کچھ اس خوبی
سے ادا کیا کہ ایک دن کی صحبت کئی دن کھنچ گئی، اور بھانڈا پھوٹ گیا۔ ٹول صاحب
تک قصہ پہونچا۔ اِدھر ایجنٹ صاحب کا بیڑی "کھیل لاس ہو گیا۔ ظالم دو منٹ
میں یہ جا وہ جا نہ معلوم زمین کھا گئی یا آسمان۔ کمرے سے نکلا اور غائب۔ اس سے
اچھا بریک ٹیکل جوک نہیں ہوا۔ اور ان لوگوں کا کھلانے پلانے میں خاصہ خرچ ہوا

احمد حسین، احمد علی اور ظہیر اس زمانہ میں ساتھ رہتے تھے، تمام بچپن اور
جوانی ہماری اور احمد حسین کی ساتھ گزری۔ مگر بورڈنگ میں کبھی ساتھ نہیں رہے
ایسا فرشتہ خصلت، بے لوث، مرنج و مرنجاں شخص مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی
آج تک ان کا اور ہمارا اختلاف ہی نہیں ہوا۔ کیا اٹاوہ اور کیا علی گڑھ، ایک
کلاس میں پڑھنا، میلے ٹھیلے، مجلس، خانقاہوں میں ایک ساتھ جانا، ایک ہی جگہ
وکالت شروع کرنا، یہ سب ایسے مواقع تھے کہ جہاں بھائی بھائیوں میں نہیں بنتی

مگر ہم دونوں میں آج تک زبانی تکرار کی بھی نوبت نہیں آئی بیس بائیس برس سے ہم حیدرآباد میں ہیں، اور وہ اٹاوے میں ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ ذرا ذکام ہوا کہ بس ان کی یاد آ گئی۔ اس جگہ تذکرۃً ان کا ذکر آ گیا

کچھ اپنے متعلق

ایک مستقل باب قائم کیا جا کر اس میں ان کا ذکر آئے گا اس وقت اتنا کافی ہے کہ

سیر نگشت چشم ما از نظر جمال تو

ہست درونِ جان ما ہر نفسے خیال تو

شیخ احمد حسین کے ساتھ مرزا حسین احمد بیگ بھی یاد آ گئے۔ وہی مثل ہوئی کہ "بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا" روز ہمارے فیصلوں کے خلاف نگرانی، اور اور مرافعے سنتے ہیں۔ مگر ان کی طرف قلم کا رخ اب تک نہ پھرا۔ سن لیجیے۔ مرزا صاحب

ہمارے دونوں قسموں کے دوستوں میں سے ہیں۔ یعنے متروکہ بھی اور مکسوبہ بھی متروکہ اس طرح سے کہ یہ نواب سرور الملک بہادر کے بھتیجے ہیں۔ یہ ان چند عشاق کی قسم سے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ

بچپن سے لکھی تھی مری قسمت میں اسیری
ماں باپ کہا کرتے تھے دل بند جگر بند

ہیں تو شروع ہی سے یہ مرزا صاحب مگر جوانی میں آپ سے زیادہ بتانت زدہ صورت بنائے رہتے۔ گریۂ عابد نماز کرد و الا مضمون رکھتے تھے۔ اور وہ سب کے تعلقات کا اظہار نیچہ اور خمیرہ تمباکو کے ذریعہ سے تھا۔ چلم بھی حالانکہ علی گڑھ کی کہیں خوبصورت ہوتی ہے، لکھنو کے ہی استعمال کرتے تھے۔ یہ گھوڑ دوڑ عدالت کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ پہلے تو پیسے خرچ کرکے یہ کھیل کھیلتے تھے۔ اب تو دو ہزار گورنمنٹ سے جھڑا لیتے ہیں۔ اس کو کہتے ہیں اختر شناسی۔ اٹھائیس برس سے ہی پاپڑ بیل رہے ہیں۔ کس بلا کے اختر شناس تھے بھئی واہ۔ یورپ کی بھی سیر کی ہے، اور

دل کھول کر مگر یہی پارک کو اب تک نہیں بھولے۔ رات کو پڑھنے کا بہت شوق تھا
عدالت کے قیام میں جو کچھ تھا اُٹھ جاتا تھا۔ اب بھلا مٹی کے تیل کو کہاں سے آئے
کمرے سے نکلے راستہ کی لالٹین سے کبھی نکال لی، اور صبح فرمایش ہو رہی ہے کہ
بھائی اسے رکھ آنا۔ اپنے روم فیلو کی ہر چیز کی حفاظت کرتے تھے۔ دونوں کی جوڑی
اچھی تھی۔ یہ سرخ و سفید، وہ ملیح و مدقوق، اپنے بی، اے میں فیل ہونے کا جھیر
التزام دھرتے ہیں۔ پرانی رسوم قائم ہیں۔ اِدھر رکنیت عدالت العالیہ پر فائز ہوئے
اُدھر سوا سیر مٹھائی کا دونہ ہمارے گھر پہونچ گیا ۔

علی گڑھ زندہ باد

(باقی آیندہ)

ترانہ

وہ مسلم کی آنکھوں کا تارا علی گڑھ
ہمارا علی گڑھ تمہارا علی گڑھ

بنا کر سیاسی اکھاڑا علی گڑھ
بنایا کہ تم نے بگاڑا علی گڑھ

جو بچپن ملے پھر تو مل جائے شاید
پیارا علی گڑھ دل آرا علی گڑھ

گئے دن جو مُردوں میں پڑتی تھی جانیں
جہاں قُم باذنی پکارا علی گڑھ

یہی ایک دو تین عہدوں کی خاطر
پہنچنے نہ پایا بچارا علی گڑھ

ہے خوش چند روٹی کے ٹکڑوں پہ مسلم
اٹھاتا ہے لیکن خسارا علی گڑھ

اخوت سے نفسانیت کو بدل دے
دکھا دے وہی پھر نظارا علی گڑھ

سبق جو بھلایا ہے خود غرضیوں نے
وہ پھر یاد ہم کو دلا جا علی گڑھ

بہت سے ہیں پھر سرفروشی کو حاضر
مگر ہاں کرے گر اشارہ علی گڑھ

علی گڑھ

علی گڑھ نام ہے اس تربیت کا جس میں مضمر تھی
فلاح قوم۔ آپس کی محبت اور خودداری
رہا کرتی تھیں ساری رنجشیں کالج کی کالج میں
زباں پر چاہے جو کچھ ہو مگر کینے سے دل خالی
ضیاء الدین۔ فخرالدین۔ عبدالحق نمونے ہیں
کہ جس فن میں پڑے یہ ہو گیا وہ فن ہی خود عالی
حقیقی سیّد احمد خانی وہ تعلیم تھی جس نے
لنڈن سے لیکے منٹو تک یہ اپنی دھاک بٹھلادی
اگر اب تک وہی ایثار ہے شفقت ہے الفت ہے
تو بیڑا پار ورنہ آگے آگے اور دُرگت ہے

خطاب با قابضان

تجھکو رہنا ہے جو دنیا میں تو رکھ اپنوں سے بیر
زعم ہے طاقت کا گر طاقت نہ تو اپنوں کی توڑ

زینت گلشن تو ہیں کوپے د مگر شاخوں سے ہین
باغ کی رونق جو ہے منظور مت شاخین مروڑ

درہم و برہم اگر ہونے کو ہے محفل تری
شام ہی سے کس لیئے جام و سبو دیتا ہے پھوڑ

ہمت مردانہ رکھ اندیشۂ فردا نہ کر
اپنے ہاتوں سے نہ اپنے جام میں لیمو نچوڑ

جھیل سکتا ہی نہیں ساون کی جھڑیاں تو اگر
خوف سے شبنم کے صحن گلستاں دیتا ہے چھوڑ

دل سے اپنی خواہشیں اغراض بیجا کی نکال
ورنہ اس زنجیر کی کڑیوں کے کھل جائینگے جوڑ

اب بھی لے سکتا ہے تو ٹوٹے دلوں کو ہاتھ میں
پھر بھی یہہ تارے چمک سکتے ہیں بنکر کہکشاں

التفات باہمی کی پھر اگر کنگا بھئے
یہ زمین شور ہو سکتی ہے رشک بوستاں

لاکھ پردوں میں ہو پوشیدہ مگر چھپتا نہیں
چارہ سازانِ محبت سے کبھی دردِ نہاں

ہو پرستارِ وطن میں خود پرستی کی جھلک
یعنے جنت کا چمن اور اس طرح صرف خزاں

ظاہری تعریف میں تو ہو رہے ہیں ہونٹ خشک
دل سے آئینے پہ ہے گردِ کدورت الاماں

کرکٹ کلب

مسلمانوں کے حق میں کم نہ تھا ہر گز قیامت سے
غدر کا انقلاب سخت اور سائنس کا ریلا

زمانے کو ضرورت تھی ابھی کچھ اور مسلم کی
جو سرسید کے دل میں درد ملت کر دیا پیدا

بڑے مسلم کش اک صاحب کلکٹر تھے علیگڑھ کے
حمایت اس پہ چھوٹے لاٹ کی اک اور تھا طرا

زمیں دیتے میں کالج کی بجیں لاکھوں لگاتے تھے
کبھی چپکے سے دیتے تھے سمیع اللہ کو بھڑکا

ادھر ہنٹر کی تصنیفوں پہ تصنیفیں نکلتی تھیں
ادھر تھا کانپوری مولوی صاحب کا استفتا

لٹن نے کی مگر تائید جب کالج بنانے کی
تو سر ولیم میور نے خود ہی اپنا دیدیا چندا

مصلے سے غرض اٹھتے بقول حضرت اکبر
لگا سرعت سے ہونے پھر تو چونے اینٹ کا دھندا

غرارہ دار پیجامہ کی جا پتلون نے لے لی
چھپا خورشید مشرق اور ہلال مغربی چمکا

سڈلن اور آرنلڈ اور بیک نے فی الجملہ کوشش کی
کہ پیدا ہو نہ اب اس قوم میں مسجد کا کٹ ملا

بیان علم و فن عبد الحق کریں یا فخر دیں کر لیں
کہ ہم نے تو کبھی اس راہ میں خرچا نہیں دھیلا

بنے پڑھ پڑھ کے لیڈر اور بلیڈر اور پروفیسر ۔۔۔ مشن سید کا پھیلا کچھ تو کرکٹ ہی سے ہے پھیلا

یہی زندہ دلِ ستلج بیاس و راوی و جہلم ۔۔۔ جنھوں نے جیبِ سید کو دیا تھا خوب ہی گرما

مگر بھیجے تھے کتنے لڑکے اپنے پڑھنے کالج میں ۔۔۔ نہ جبتک کھیلنے کرکٹ لگے احسان و عبداللہ

سر آغا خان علیگڑھ پھر کہیں تشریف لائے ہیں ۔۔۔ کہ جا کر ٹیم نے جب مستری سے لے لیا بدلا

صمد کرکٹ کے باعث ہی بنے متھرا میں او بی ای ۔۔۔ پھراتے ڈاکٹر ناظر رہے اسکول کا گھوڑا

کلائی کا کہیں ہم زور اسکو یا مسلمانی ۔۔۔ کہ کھیلیں آپ اور دیوار مسجد پر گرے گولا

لٹک لیلائے کرکٹ کی جلندھر والوں نے چھو ۔۔۔ کہ ہے فوجی کلنڈر میں ابھی محمود تو چھوڑا

مگر عشاقِ باطل سی ہیں اسکے حضرت اصغر ۔۔۔ کہ بلوا تو لیا ہم کو نہ میلا نا نہ ہے بھتا

وہی حالت ہے کرکٹ ٹیم اور کالج کے چندے کی ۔۔۔ کہ پہلے تو تجارت اور پھر انگریز کا جھنڈا

خدا جانے کہاں تک سچ ہے لیکن سنتے آئے ہیں ۔۔۔ کہ سر سیّد نے خود محمود سے اک روز فرمایا

حجاب اسکو کہو وحشت کہو یا ڈر حکومت کا ۔۔۔ نہ کھیلیں ساتھ گر باہم نہیں جاتا نہیں جاتا

حجاب نوعروسِ آئی سی ایس اٹھنے والا ہے — کہ زین الدین کے بھی ہاتھ میں ہے گیند اور بلا

ذرا اس امر کو جھک کر نذیر جھنگ سے پوچھو — کہ مدت سے انہیں اس فن میں حاصل ہے یدِ طولیٰ

یہ زین الدین وہی ہیں جنکی اک لمبی داڑھی ہے — جنھیں آخر ملا رہنے کو بنگلہ بھی کلکٹر کا

کلرس بیک نے رکھا جو کالج کی بلیزر کا — انھیں تینوں رنگوں سے اب بنا ہے ویس کا جھنڈا

فضیلت سارے کمروں میں ہے اب تک تیرہ نمبر کو — کہ جیسے مسجدوں میں سب سے افضل مسجدِ اقصیٰ

رہے شوکت علی سرے کے تا عبدالحمید اسمیں — مگر آ کر نہ ٹھیرے مستقل ایچ ایچ حمید اللہ

شہنشاہی کبھی اسمیں کبھی سازش کبھی شوخی — کبھی لکچر کبھی کشتی کبھی کورس کبھی طبلا

وراثت میں ملا کرتا تھا سب سامانِ فرنیچر — سلام الدین تک تھے یہ چلن ہرگز نہیں بدلا

لگا رہتا تھا اسکی سٹڑ ہیو پر ایک میلا سا — کبھی تھا دورِ فیرنی کبھی چلتا تھا فالودا

کھلاڑی سب پرانے یاں پہ سید آ دیکھتے تھے — نہ خوفِ ماسٹر محمود نے مسناٹ کا تھا

ٹننگ صاحب مگر البتہ آ کر دیکھ جاتے تھے — کہ پتلون زیرِ تکیہ ہے جو تا تو نہیں میلا

سلام الدین کے بعد آنکھ تھی شفقت کے کمرے پر
نمازیں بھی پڑھیں پر سولیا کیا تعویز اور گنڈا

رضا محمود - بھوندو زور سے پکڑے رہے انکو
نہ ایف اے سے قدم انکا بڑھا آگے تو پھر انکا

اب اسکے بعد جب میجر نظیر اسلام خاں ہمکو
مراد آباد سے منگوا کے دیدیں اک عدد حقا

تو اک تاریخ تحقیق لکھ دیں یکچی بارگی
شرر نے جس طرح لکھا فلورا اور فلورنڈا

نہ دیکھے انہیں اب کوئی مسکرا کر
زبان بند تسلیم داڑھی کی خاطر

رضا اور مشتاق اللہ اکبر
جہاں چہاں ماریں پینجر اوڑا کر

جمعیت کی نیابت پہ جبار نازاں
نظیر اسلام اب ہیں بیلوں کے اوپر

کرسمس کی دعوت وہ کرتے ہیں اور یہ
نہاری کی حد تک نہایت مخیر

طبابت کا کیا ذکر ہم نسر فروشاں
نہیں مرتے بستر پہ بیمار پڑ کر

بریں ہم ہیں موجود مقصود علیخاں
قوی جو بنا دیں قوی سے قوی تر

نظامت پہ T.B کے ایکسن نی
نہ ناظم ہی پھر بھی استاد گر ہیں
غرض چپہ چپہ وٹپہ بہ ٹپہ
آلہی مری خیر قدوائی صاحب
جو اپیشہؐ کھیلتے ہیں لگا کر
وکالت کیسے تنبورے کے تار ثانی
یہ شیر نیستاں یہہ ہی گر یہ سکیں
حمیداور انکی ملاحت سے قایم

تصانیف جن کے ہیں ستر بہت سے
کر سجاد مرزا بتاتے ہیں ٹیچر
علی گڑھ علی گڑھ علی گڑھ برابر
متانت زدہ اپنی صورت بنا کر
یہہ بازی یہ انسان ۔ گودام موٹر
مجرو بذات اشترا کی بھتر
ہیں ور وھائیں گا ندھی تو میونخ ہیں ہٹلر
تعلق یہ ہراج وسگریٹ و مرمر

تردد بڑا ہے یہہ خیرات علی کو
کہ زائر ہیں چند اور بکثرت مجاور

سالانہ ڈنر

کیوں نہ پھریں علیگڑھی سانڈ بنے مگن مگن
اتنے علیگڑھی ہیں یاں ایک نہیں علی گڑھن

ہم سے غریب کی معین جیب ٹٹولتا ہی کیا
لے نہ ٹکٹ کے دام آج گھر میں تو آنا ہے لگن

اُنسے لپک کے کچھ تو لے ہیں یہ چھتاری کے نواب
حفظ قرآن ہی انھیں فیض رسا ہیں خوش چلن

بڑھ گئی انکی ذات سے اور گورنری کی شان
مونچھیں چڑھی ہیں قد دراز۔ ہاتھ سخی رسا دہن

جلد الٰہی آملیں ہم میں وہ ہو کے تندرست
تابع حکم جسکے ہے ملک کی چھن چھنا چھن

وید۔ قرآن، بائبل، تھانے عدالتیں سکول
قبضے میں لیکے بیٹھے ہیں مولوی اظہر حسن

گویا ٹرینٹی کی آج بن گئے زندہ اک مثال
عسکری یار جنگ یعنے کہ عسکری حسن

رنج گر یہی رہا کیسہ اوڑائیں فاختہ
ہیں نہ لدوڑہی خاں یہاں اور نہ مولوی مگن

قوم کسے یہاں بتائیں کسکی وہ آسیاں چرائیں
کسکی اٹھاکے سیج کو لیکے چلیں سوئے چمن

کسکو دکھائیں آئینہ کسکو پہنائیں چوڑیاں
کسکی اٹھائیں یاں برات کسکو بنائیں یاں دلہن

بھول کے عمر وہ تھری اسپہ بھی پہنیں کی داہیں
ملکے جبار اور ہم گالیا کرتے ہیں بھجن

آنیکو لاکھ بار آئے یوں تو سبھی کے یار غار — غم ہے مگر یہہ لطف کو آئے نہ ایکدن چین

آؤ چلیں بھی شیخ جی تا گجہ ہی آجکل سہی — جو ر نیا ش جب نہیں ہیں کون منگائے اب فتن

لاکھ روپیہ کی ایک بات بولے بیا بشیر راست — ہم تو ابھی جوا ہیں چمن خ ہوا کرے کہن

آنیکو لاکھ بار آئے آگ نئی لگا جائے — بوئے چمن چمن سے ہے یا و صبا تو ہی سرشکن

انکو اگر کوئی بلائے۔ کوئی پھر آئے یا نہ آئے — رخصت کار خاص لے آئیں گے ناظر حسن

عشق کوئی جتائے کیا۔ دلکو کوئی لگائے کیا — جان سے کوئی جائے کیا واریاں نہ ہے رسن

فخر الدین صاحب المخاطب بہ نواب فخر یار جنگ بہادر

صدر المہام عدالت و امور مذہبی

اگرچہ نزد اس پا بعد جنگ بھی لکھے ہیں — علیگڑھ ہوں میں تھانہ دار سے لیکر گورنر تک

ججی سے صوبیداری سے نظامت سے نیابت سے — پہنچ جاتے ہیں یاں بھی گرتے پڑتے صدر دفتر تک

پھر اسکے بعد قابل ہو نکہ جاہل ہو نکہ کاہل ہوں
رہا کرتے ہیں جو کہ توان سن آذر سے اوس آذر تک

خدا کے فضل او شاہ دکن کے حکم سے آخر
خوشی کی لہر دوڑی ایک سرے سے جلندہر تک

عدالت اور اسکو مذہبی میں ... ہی
نظر آتے ہیں صیغہ وار سے کونسل کے ممبر تک

الاّ یا ایوہل ہو نشینان ہے کوئی ایسا
جو چھوٹے آئے ہیں چلکر معین الدین کے گھر تک

سیّد عسکری حسن فرخواندہ نواب عسکر یار جنگ مشیر قانونی

دعوت کا مستحق ہوں میں ہی نہیں اکیلا
ہم سب پہ ہو کرم اب یا صاحب بھیڑا

اب وہ موکلوں کا باقی نہیں جھمیلا
حاضر خوشآمدی ہیں در پر لگا ہے میلا

یہہ بھانڈ بھی ہے حاضر بہ تبرکت فقیرا

اے عمر رفتہ آجا پھر وہ سماں دکھا جا
بچھڑوں کو پھر ملا جا روتوں کو پھر ہنسا جا

فقرہ کوئی سنا جا پھبتی کوئی اڑا جا
سگریٹ انہیں بنا جا سلفہ مجھے پلا جا

ڈبہ ہے نیوی کٹ کا اور لکھنوی خمیرا

بچپن اُدھار لیکر ہم سب یہاں ہیں آئے	اسواسطے کہ خدمت عسکری ہیں پائے
تثلیث کے ہیں مجمع جس عہد میں سمائے	واجب ہے ایک ہے لے ٹھہر کر صدا لگائے

منگواؤ کیک بسکٹ اور گاجروں کا حلوا

کہنے میں کیا تکلف کھانے میں کیا شرم ہے	چندے کا یہ ثمر ہے ہر شخص کی رقم ہے
ہے قورمہ جو ٹھنڈا کیا یاروں کا غم ہے	ہر چیز میں مزا ہے پہلو اگر گرم ہے

روٹی رہی جو کچی زردہ رہا جو پھیکا

پلٹن کے ساتھ اپنی ہے معتمد سدھارا	کیا کیا کرے اکیلا خیرات علی بیچارا
اب بیٹھے بیٹھے کیجئے یاں گھانس کا نظارا	گھبرا کے آخرش وہ بے ساختہ پکارا

کہئے تو میں منگا دوں اُنسے اچار خورجہ

دو دن کی زندگی میں کچھ مفت کی تمک دو	خوش گپیاں کرو کچھ بنگلے ہمارے بیرو

قومی ضرورتیں جو ہیں پیش نظر تو پڑھ لو
پیام میں سرِ راہ رہبر میں نذرِ رہرو

کھاتے ضرور رہنا پر ناشتے میں انڈا

ہز اکسلنسی کرنل نواب احمد سعید خان صاحب

کے اعزاز میں قدیم طلبا علیگڑھ مقیم حیدرآباد نے ایک شاندار ڈنر باغ عام میں دیا تھا اسمیں یہ نظم پڑھی گئی

دیکھو تو کیسی تگڑی اپنی برادری ہے
یعنی کہ صدرِ اعظم بھی اک علی گڑھی ہے

گھر پر نواب صاحب سنگھم پہ ہیں ہز آنر
اب یاں مخاطبت میں ہز اکسلنسی ہے

ہوں ویر یا بہادر مسٹر ہوں یا مہاشے
انکی نظر میں یکساں ملّا و پادری ہے

ہندو ہیں یا مسلماں بھائی ہیں انکے دونوں
انکا یہی ہے مسلک انکی یہ پالیسی ہے

دل بھی بہت غنی ہے اور ہاتھ بھی سخی ہے
اور اسپہ صرف دولت یا شانِ دلبری ہے

ہم سب کو فخر ان پر۔ کالج پہ فخر ان کو
اس انکسار میں بھی کیا شانِ افسری ہے

برٹش کا تاج و نخلِ خرما۔ ہلال گردو
پرچم یہی ہمارا سدِ سکندری ہے

کہیے تو اک پھڑکتا جو بولا اپنا دل
ڈھیلے پہ کون گاتا یار واساوری ہے

ہاروں ہوں ضیا ہوں قی ہوں یا کہ ہنڈلی
نور الحسن تھے پہلے اب چرخ آوری ہے

کالج کے نوکروں میں تبہ ہے وہ ہمارا
آموں میں آم جیسے لنگڑا بنارسی ہے

بیٹا ابو الحسن کی سنکر یہ بولے ناظر
نمبر پہ کیسے لیلوں تجویز سرسری ہے

بیٹی میں احمد اللہ۔ اظہر حسین گھر میں
تحصیل پہ لیاقت اللہ لڑنیکو عسکری ہے

وڈی ڈنڈے نظیر اسلام خاں کھڑے ہیں
گردون شکوہ آگے اک گھانس کی گری ہے

محبوب کا تصور۔ عباس سے تکلم
پشاوری تخیل قندھاری شاعری ہے

لو دیکھئے تو انکو بیٹھے ہیں کیسے اکڑے
بوٹے سے قد پہ انکے کیا شان میجری ہے

Encore حج سر محمد یعقوب قوم کہئے
جھنڈے تلے مسلم حضرت کی لیڈری ہے

تعریف اپنی سنکر میجر معین بولے
میں کیا یہ آپ ہی کی سب بندہ پروری ہے

آنریبل مسٹر غلام محمد صاحب علیگڑھ

(دنیائے اسلام میں)

"کیا بلکہ سارے ہندوستانیوں میں حساب محاسبی کی دنیا میں یکتائے روزگار ہیں جن کا لوہا برٹش انڈیا کے ماہرین فن مانے ہوئے ہیں جب اس ریاست اید مدت کیلئے صدرالمہام ہوکر آئے تو علیگڑھ کی طلبا نے بڑے جوش و خروش محبت تپاک سے انکا خیر مقدم لشیر باغ کے شاندار تھیٹر ہال میں کیا جہاں ڈنر کے بعد یہ نظم پڑھی گئی۔"

(۱)

آمدی خوش آمدی با صد وقار داکری | جانشین فخر دین کو بود بعد حیدری

در فروغ وارتقائے تو کسے آذر نہ بود | خوئے تو بیزار ماند از بت گری بت پروری
تو غلام یک تن است و من غلام پنجتن | لیک آں یک تن بدیں من بدار د سروری
نسبتے دارد تو با پیغمبرم در خادمی | چاکری کو چاکری قربان او اسکندری
بر بساط مالیاتی از تو موزوں تر نہ بود | شانِ شایانِ نگاہِ انتخابِ خسروی

آمدی خوش آمدی با ساز و شانِ دلبری

(۲)

بورڈنگ لال لف کی یاد آئے کبھی گر رو لکال | لیاقت اللہ کہنے کو موجود ہیں حاضر جناب
صبح مسجد شام مسجد دن میں کمرہ اور آپ | فارغ ہو لے یاد کر نہیں ہوا غارت شباب
فون پر لبیک ای رحمٰن کہتے آئینگے | لیکے ساتھ اپنے مداخل و مخارج کی کتاب
اندرونِ بلڈ پے شیٹین لئے عبد السلام | ہاتھ میں ہے لال پنسل منہ پہ ریش با خضاب
ہو برج کا شوق تو حاضر ہیں یہ اظہر حسین | اک کلب پہ چار سیڈ انکار رہتا ہی جواب

کشتہ لیلائے الیکشن یعنی عسکر یار جنگ | پھر زریم قوانین ہو گئے اکثر باریاب

روز اک حقہ نیا ہے اور چلم ہر دم بھری

(۳)

افسروں کو مفت یا قرضے پہ موٹر چاہیئے | ریل کہنہ ہو گئی لوہے کی پٹری چاہیئے

گردش چشم کرم کے منتظر۔ انجنیر | گتہ داروں کیلئے روپیوں کی گٹھری چاہیئے

میس خانے کیلئے ٹن میٹ ہوٹن چیز ہو | یاں کوڑی کھاتا نہیں ہے بھینس بکری چاہیئے

وسیکبہ کے واسطے امبیل کافی ہے مگر | شیخ کو ہر رات اک غنی کی سحری چاہیئے

سیٹھ کالو رام جی لیے لوڈی پوڑ ہو نہ ہو | ساکھ پر پیری مگر ہنڈی تو سکھری چاہیئے

سیٹھ جی جب بات کہتے ہیں تو کہتے ہیں کھری

(۴)

سب طرف داد و دہش جاری ہے لیکن الاماں | لال پنسل اس محکمے کی ہے اک گرز گراں

علم سیم وزر نہیں ہے کوئی بو وہن کی شکر
مارکٹ جا کے لے آئیں جو ارزاں و گراں

لوگ کہتے ہیں کہ سائنس علم دریا دہے
دانے چارے پر مگر چلتی ہیں یاں تو قینچیاں

اک اٹھنی ایک چونی دو دوانی کون لے
چار مینا ری کے چھ کم تیس گنڈے ہوں جہاں

جان کا بیمہ ہو یا موٹر کا اک صد کی عوض
اکیسوالہ وہرا لیتے ہیں قدر وای میاں

لطف کی پڑتی ہے انیر نگاہ سرسری

کرکٹ ٹیم کی مدیر

اے ہونہار بچو جب تم وہاں نہیں تھے
(نوٹ: اپنے مذاق کے مطابق دوسرا مصرع کہہ لیجئے)

ممتاز و سیکڈ انل ابجے رڈنگ جہاں ہیں
شہتوت و آم تھے وال الحسن ہری ہری تھی

صرف ایک میر حبیب مناسب کے پراکٹر تھے
دفتر کی کچی بارگ میں ایک کوٹھری تھی

محمود حسن کا تھانہ قایم نہیں ہوا تھا
پھاٹک پہ خان کی تو البتہ نوکری تھی

خائف پہاڑ خاں سے بنے ڈور اُنسے حسن کا

افغانی خوں رگوں میں اور زور ماریسن کا

وہ آبریج بولڈ صاحب جو آبریج دیکھ نکلے — اسکول اور کالج میں کر گئے جدائی

کیسے بلک بلک کر روئے امیر احمد — پہونچی جو ہیگ ڈانل حضرت کی چارپائی

راتوں کو روند پر پھر تھانے دار نکلے — "ہرگز نہیں ہرگز" کی چیخ اِک لگائی

بمبو قیت پہ پہرا جو کی ہوئی جو قایم — جنت سے آکے غالب نے نظم اک سنائی

القصہ فاختہ کا لائسنس جب نہ پایا

جا کر شکاریوں نے تھانے پہ گدا اڑایا

تعلیم باطنی وہ یعنے علیگڑھ ہیت — قایم بھی ہے ابھی تک یا دوستو شادی

تنہا خوروں سے لینے سگریٹ تو سب مکھن — مسٹر مرسے کی اب بھی آتی ہے کیا سواری

آئینہ ہے یہ رست سلا بٹتے تو ہیں برابر — اپریل فول کے دن اتبک خطاب شاہی

ضمانت تھی یارو غارت نہیں ہوئی ہے
بارگ ٹرسٹیوں نے سنتے ہیں کھو ڈالی

ہے دعویدار باقی اب کوئی بوبیت کا
اور کس کے سر پر سہرا ہے آج قومیت کا

یاد کہن کو تازہ کرنے کو آ گئے تم
لائے نہ ساتھ اپنے کچھ میرٹھی پراٹھے

ٹیمیں بنا کے باہر ہم بھی بہت گئے ہیں
لیکن تم ہم سے بڑھکر واللہ نکلے غانٹے

ممتاز فرنی والا کیوں ساتھ میں ہے آیا
مطلب یہ ہی ہے سارا ہم سبکو یاپسانٹے

ہمپر نکالا اوسنے چار آنے بھی جو قرضا
رستہ بتاؤنگا میں واللہ سب کے گھر کا

چشم حسد کو بند ہی رکھ آج چرخ پیر
بیٹھے ہیں ملکے بیشتر سید کے سوربیر

مٹی کہیں کی ہو یہ علیگڑھ کا ہی خمیر
الفت میں جسکے ولیہ سے میڈن کی تیر

گو آج دور دور ہیں اور دل ملول ہیں
لیکن ہم آپ ایک ہی ڈالی کے پھول ہیں

وائس پریسیڈنٹ جو بن ٹھن کے آتا ہے ؟
اور جھک کے کون فرش تلک لپٹنے آتا ہے

پیچھے سے آکے کون ٹرمپٹ بجاتا ہے
آنکھ اک نکال کیا کوئی اب بھی یہ گاتا ہے

آنکھیں ہیں فرش راہ ذرا دیکھ بھال کے
جرمانے سب معاف کرو پچھلے سال کے

اپریل میں خطاب بھی آتے ہیں یا نہیں
گرمی میں فاختہ بھی اڑائے ہیں یا نہیں

شکل آئینہ میں اب بھی دکھاتے ہیں یا نہیں
راتوں کو چارپائی اٹھاتے ہیں یا نہیں

مسٹر مرے بھی کیا کبھی تشریف لاتے ہیں
تنگ آ کے آپ بھی کبھی بستر جلاتے ہیں

چند عزیزوں کی کالج سے آمد پر

کلیاں نئی جو چند یہاں آج آ گئیں
یاد کہن کی بجلیاں دل کو جلا گئیں

دلبر گھٹائیں عمر گزشتہ کی چھا گئیں
اور بچپنی کا آنکھوں میں نقشہ جما گئیں

یہہ آنے والے ساتھ عجب چیز لائے ہیں
سوغات لیکے عمر گزشتہ کی آئے ہیں

صحن چمن میں آپ ہیں اور ہم چمن سے دور
ہنگام کارزار میں دار و رسن سے دور

دل سے قریب ہیں مگر انجمن سے دور
مسلم کبھی رہا ہے بھلا پنجتن سے دور

اچھا ہو یا برا ہو علی گڑھ ہمارا ہے
ہر خار واں کا پھول سے زیادہ پیارا ہے

سالانہ ڈنر

باتوں سے فقط سو کبھی کچھ کام نہیں چلتا
تھی شان کرسمس جب کھلواتے اگر ٹرکی
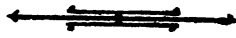
اسلام کے پردے میں یہ کیسی کرسٹانی
تاریخ بھی سوجھی تو اکتیس ڈسمبر کی

اے لیڈر فرمائیں تقریر وہ ہو جسمیں
تائید ہو چرچل کی تردید ہو ہٹلر کی

اخبار پڑھے جاؤ غفار کا ہے فتوے
پرواز کئے جاؤ تحریک ہے ناظر کی

پھرتا ہے کفن باندھے خود مسلم وارفتہ
بگڑے گی بھلا کیسے پھر بات سکندر کی

گولی تو نہیں کھائی چھینٹا تو نہیں مارا
اے شیخ اوڑاتا ہے کیوں آج بھی بے پر کی

معدے کی خرابی کا ہر شخص کو رونا ہے
بیگن سے کہیں زیادہ ہے مانگ ٹماٹر کی

قدوائی کا ذکر آیا فرمانے لگے ہنس کر
گن انکے خدا جانے صورت تو ہے شوفر کی

لیلائے تمدن خود اب پائل ناقہ ہیں
پٹرول کا خدشہ ہے پروا نہیں موٹر کی

ساقی کی نوازش پر سب آس لگائے ہیں
اب دینے کو جو ویدیٔ نیت تو ہی کوثر کی

تھا نغمۂ بلبل بھی کچھ اور گلستاں میں
کچھ اور ہی رنگت تھی گلشن میں گل تر کی

کر ہی لیا آخر کو یہ جلسۂ سالانہ
رستم سے کہاں ہوتی جو تم نے مہم سر کی

سالانہ ڈنر

آدمی مجھ سا تو ہو یارو دبنگ
چھین لے دھتکار کر تیر و تفنگ

واہ رے استاد کیا نکھرا ہے رنگ
سرمئی وردی ہے اور گھوڑا سرنگ

آج کھانے پر تو ہو جائے گی جنگ
ہیں نہ تیتر ہی نہ قازیں اور کلنگ

کم نہیں ہٹلر سے ہے جبار کچھ
قد وہی تیور وہی وہ ہی ترنگ

معتمد جب سے ہوئے میجر معین
نوٹسوں سے ہو گئے ہیں لوگ تنگ

لوٹھٹ - پیسے دہرو - کھاؤ نہ کماؤ — دوستوں کے یہہ کھیں ہوتے ہیں ڈھنگ

الوداع یا سیّد اظہر حسن — السلام علیک - ناظر یار جنگ

چلدئے اب ہم کھلائیں گے کسے — قورمہ نواب عسکر یار جنگ

کوئی آئے بھی تو کس اُمید پر — یاں نہ افیون ہے نہ گانجہ ہے نہ بھنگ

پیچ کچھہ ایسے پڑے تقدیر سے — وہ لڑاتے ہی نہیں ہم سے پتنگ

جان کا بیمہ کرانا ہی پڑا — کھیل سمجھے تھے وہ قدوائی کا سنگ

عذر بوسہ اسقدر تھا بے پناہ — رہ گیا قاضی بھی جسکو سُنکے دنگ

ہیں کہاں دیکھیں ذرا میری طرف — خالی جاتے ہی نہیں جنکے خدنگ

پھر بھی پڑتی ہے تمہیں پر ہر نگہہ — گو ملاحت ہے نہ صورت ہے نہ رنگ

نہر کی باقی نہیں شیریں کو چاہ — حضرت فرہاد اب لکھو دیں ننگ

اب وہ اُلفت کا یہ سنجر کیا چلے — جس کا انجن تھا جوانی کی اُمنگ

یوں گزارے ہم نے اکثر ماہ و سال | سو گئے دیکھا جہاں خالی پلنگ
اب تلک دل میں امیر احمد کے ہیں | اس علمبردار لشکر کے خدنگ
آپ نے تو چھیڑ دی درگا کی گت | شیخ جی کیسے بجائیں جل ترنگ
پہلے چسکر ہیں زمین پر آرہا | کیا کرے بیچارہ کچھ ڈھیلا تھا تنگ

سرفروشانِ علی گڑھ ہوشیار
مٹ نہ جائے وہ تمہارا نام و ننگ

حسن محمد حیات حیدرآباد میں

حیات آئے ہیں لے نوید حیات | پلنگ وہ برابر سے بچھوائیں گے
بھلا دیں گے سب آج اور کل کا غم | طبیعت کو باتوں میں بہلائیں گے
نیا ایک بازار سے لا کے لیمپ | چیرٹ لو سے اسکے ہی سلگائیں گے

پکانے کو بیٹھیں گے مرغا بڑا
پکاتے پکاتے ہی کھا جائیں گے

کبھی بستر ے پر پڑے ہی پڑے
تو نے دار حقے پیئے جائیں گے

کسی کو بروہم و گماں بھی نہ تھا
وہ گھر میں مظفر کے پڑ جائیں گے

خانہ بربادی

کیوں یہ بارات اٹھائی نہ گئی
بات اتنی سی بنائی نہ گئی

بھائی قدوائی کی تم سے شادی
حیف صد حیف رچائی نہ گئی

سعید الرحمن قدوائی سلمہ

وہ لیجئے آ گئے وہ چہرے پہ ڈال سہرا — باسی کڑھی کا بنکر آیا ابال سہرا

بندھواتے وقت ظالم اتنا تجھے نہ سوجھا — اس بے ثبات رخ پر یہ لا زوال سہرا

دولہے نے کیسی تارے گن گن کے رات کاٹی — تھرا رہا ہے کہتے ماضی کا حال سہرا

درگت بنیگی خاصی کھیلی جو آج چوتھی — بچ کر نکل گیا تھا کل بال بال سہرا

سنتے اگر ہماری ہوتی نہ ایسی حالت — کرتا نہ حسرتوں کو یوں پائمال سہرا

پگڑی اچھالنے کی عادت ہے شیخ ہمکو — ہاتوں سے دونوں اپنے لینا سنبھال سہرا

شیڈول کونسا ہو کس ریٹ پر ہو بیمہ — ہے پیر طفل دولہا اور خورد سال سہرا

گھڑیاں عروج کی سب کوٹھو پہ تم نے کاٹیں — آخر کو یاد آیا بعد از زوال سہرا

کچھ دل لگی نہیں ہے بپتا نئی پڑی ہے — سن لو کہ کر رہا ہے کچھ عرض حال سہرا

قہر خدا بہ شکل انسان ساس نندیں | جنجال جی کا جورو سر کا وبال سہرا
سُسرے کی غلطیوں کا ہیں ثبوت لبھی | اپنی حماقتوں کی تازہ مثال سہرا
ٹیلی وِژن پہ کی ہے رسم شب عروسی | دولہا رہا دکن میں پہونچا شمال سہرا

قدوائیؔ اب نکالو اوٹی کا سر سے سودا
لے جائیگا مصوری یا نینی تال سہرا

سر محمد یعقوب

کل صبح بنکے وہ غارت گرِ نوم آتے ہیں | جوٹ پر ڈسکنے کی آتے ہیں بزعم آتے ہیں
اختلافات سیاسی کو مٹانے کیلئے | سر محمد جنھیں سب کہتے ہیں قوعم آتے ہیں
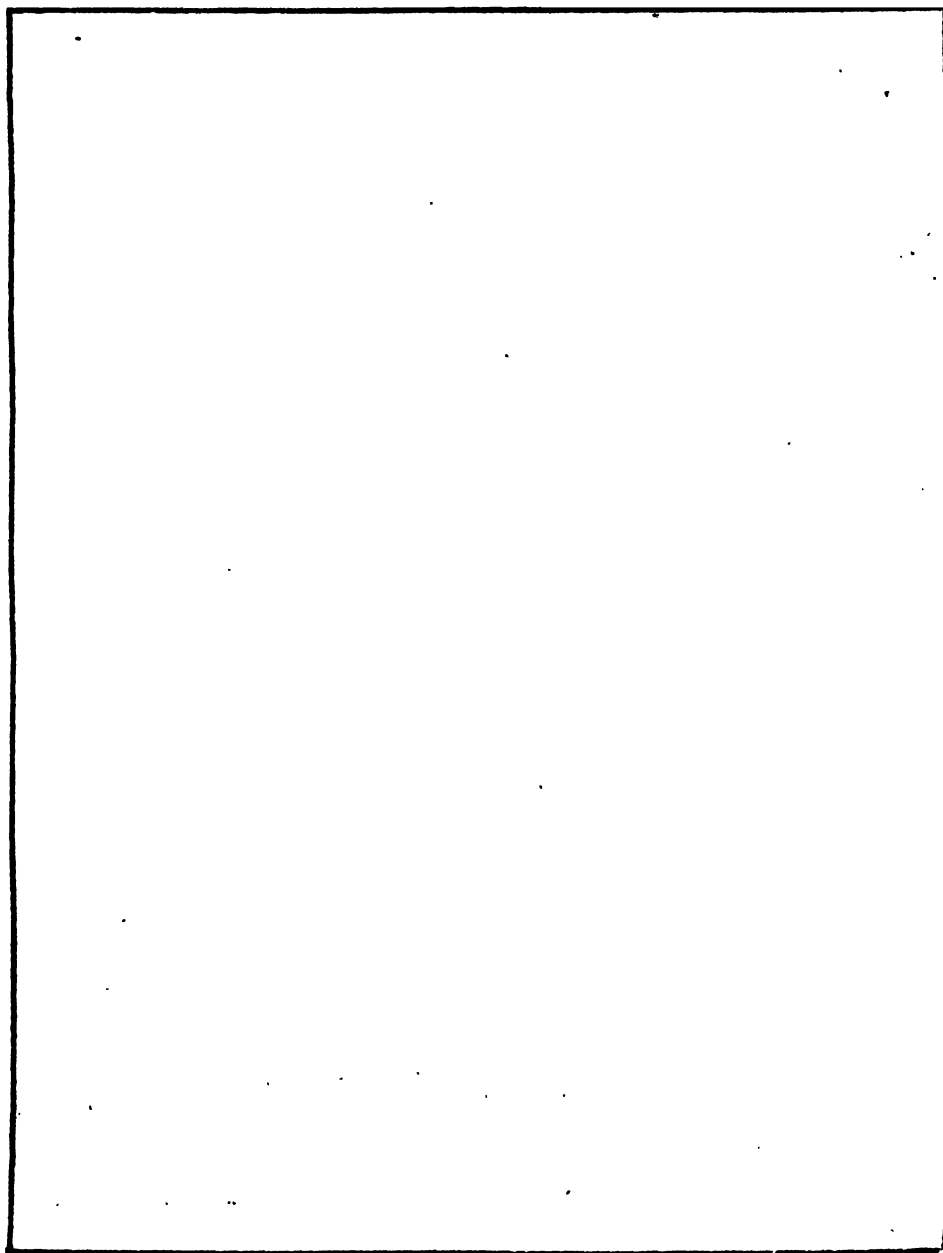
رموز

و

نکات

عجب پُر درد یہ قومی ترقی کا جھمیلا ہے

ہے اسپیچوں کی شدت اور تقریروں کا ریلا ہے

جناب شیخ پیراں اور سے طواف اٹھا یا آرس

طہارت کیوں نہ ٹوٹا ہے نہ اسپنج کو ڈھیلا ہے

عشق سے میرے خبردار ہوئے ہیں کہ نہیں
آپ سوا سرِ بازار ہوئے ہیں کہ نہیں

پاسباں روکتے ہیں اب درِ دولت پہ مجھے
شیر دیکھو یہ سگ یار ہوئے ہیں کہ نہیں

پکارتی ہے یہ ناتوانی وہ سر سے ڈالیں اُتار سہرا

کہ ضعف پیری سے ہوگیا ہے کمر خمیدہ یہ بار سہرا

وظیفہ خواں ہے وہ پیرِ دانا بندھا ہے دلمیں شمار سہرا

وہ حُبِ دُنیا کا عامل ہے، ہے صورتِ جن سوار سہرا

یہ بولا رضواں اُجڑ گیا سب اُنھیں کے سہرا سے باغ جنت

کہاں سے گلہائے تازہ لاؤں سجھاؤں جو بار بار سہرا

تھے گل سے رخسار اس بنے کے حیا سن سے سمٹ گئے ہیں

کھٹک رہی ہے بنی کے دلمیں کہیں نہ دیجائے خار سہرا

بنی کے مکھڑے پہ دُرِ دنداں نثار نوشہ نے کردئے سب

یہ زر کی قدرت کا ہے نمونہ خزاں میں لایا بہار سہرا

یوسف کی تجلّی سے کنعاں تو ہے محروم — اور مصر کے زنداں کا اللہ رے یہ مقسوم

گلچیں نے گلشن میں شاید کوئی کی بدعت — اتنی نہ اسیروں کی حالت تھی کبھی مغموم

محرومی و مجبوری۔ محبوسی و مظلومی — تقریر کی یاں بندش تحریر سے وہ محروم

صیّاد اسیروں پر یہ آج کرم کیسا — میٹھی تری باتوں کا کچھ اور ہو مفہوم

وہ حسن کی ہی ہے شوخی، یہ عشق کی مدہوشی
ہے وادیٔ الفت میں ظالم نہ کوئی مظلوم

کیوں یتیموں کا بھر کے لایا سانگ — ڈانٹ کر مانگ اونسے بھیک نہ مانگ

مفت کی پھیر ملی ہے قاضی کو — بک رہا ہے جبھی تو اوٹ پٹانگ

ڈر سے رندوں کے شیخ جی بیٹھے — باندھ بنتِ عنب کی ٹانگ سے ٹانگ

جسکی لاٹھی ہے بھینس اوسکی ہے
کیسا رانٹ کہاں کا آیا رانگ

چند ٹکڑوں پہ سوکھی روٹی کی
کھل بھلی مچگئی ہے چار و دانگ

شیخ اور برہمن میں خوب چھنی
پیکے آئے تھے آج دونوں بھانگ

انکو سو سو طرح سے سمجھایا
وہی مرغی کی ایک ٹانگ کی ٹانگ

خواب نوشیں سے ہو جیئے بیدار
دے رہے ہیں جناب مرغے بانگ

دور ہی کیا ہے منزل مقصود
مار تو یار اک جھپٹ کے پھلانگ

واعظا ذکرِ خلد پھر کرنا
یہ بتا ہے صراط کے فرلانگ

الٹا غرضکہ عشق کا سب کاروبار ہے
ہاریں تو کامیاب جو جیتیں تو ہار ہے

کیا دلفریب ہیں وہ تلوّن مزاجیاں
اُمید و یاس جنکی فسانہ نگار ہے

وہ گیسوؤں کے شغل میں ہیں اور ادہر غریب
مرہونِ سختیِ ستمِ روزگار ہے

آتی نہیں ہے ہجر کی راتوں میں نیند بھی
محروم وصل۔ موت کا کیوں انتظار ہے

وحشت کے ہر قدم پہ ہیں بیڑیاں نثار
اور رشکِ صد بہار دلِ داغدار ہے

صیاد تجھ پہ ٹوٹ پڑا کیوں نہ آسماں
دیتا قفس میں مژدۂ فصلِ بہار ہے

ہے بندگی کے ساتھ ہی دعویٰ خدائی کا
اِک چیستاں غرضکہ یہ مشتِ غبار ہے

مانا کہ چرخ کو نہیں لاتا نگاہ میں
شمشاد آپکا تو مگر خاکسار ہے

آج پھر اس شوخ سے ملنے کا ساماں ہو گیا
غیر جلکر رہ گئے اور چرخ حیراں ہو گیا

حسن بھی کیا چیز ہے آنکھوں سے جب آنکھیں لڑی
آدمی تو آدمی آئینہ حیراں ہو گیا

آپ کیا جانیں کہ عاشق کن خیالوں میں ہے غرق
آپ کی تشخیص تو یہ ہے کہ نسیاں ہو گیا

دیکھ او ناداں اپنی خواہشوں کا پھل تو دیکھ
وسعت امکاں کا ذرہ ذرہ زنداں ہو گیا

ہاتھ دہونا ہی پڑیگا کوثر و تسنیم سے
آپکا دربان اگر جنت کا رضواں ہو گیا

شیخ جیسے خلد سے نکلے تھے ویسی ہی رہے | ڈاروں کو دیکھئے بندر سے انساں ہو گیا

سوالِ وصل پہ رہتی ہے ہاں نہیں برسوں | الٰہی ٹالتے رہتے ہیں کیوں حسین برسوں
ہمیشہ وصل پہ مائل رہا ہے جوشِ شباب | رہی بھی ہے کبھی معشوق کی نہیں برسوں
لڑائی بوسے پہ تم ٹھانتے تو ہو لیکن | پھرو گے انکو مناتے ہوے تمہیں برسوں
کہاں سے لائیں وہ اب عالمِ شباب کے دن | ہمیں کو آ کے منائیں جو مہ جبیں برسوں
تری تلاش تیری جستجو میں کاٹے | ترے خیال میں راتیں گزار دیں برسوں

اب آجکل ہے کہاں وہ حجاب کا پردہ
نگاہ شوق جو رہتی تھی شرمگیں برسوں ؟

زور میں اٹھتی جوانی کے عبث مدہوش ہے | موجِ دریا چاندنی ڈھلتے ہی بس خاموش ہے
ہوشیار اے دیدۂ نظارہ جو ہاں ہوشیار | حسن بیباکانہ پھر جلوۂ زحمت کوش ہے

کھیل دیکھا بندۂ تدبیر کچھ تقدیر کا
کل جو کوسوں دور تھا وہ آج ہم آغوش ہے

توڑ دیگا محشرستانِ طلسمِ آرزو
نا امیدِ وصل کے دل میں جو غم کا جوش ہے

ایک ہی دن بس غنیمت ہے جو راحت سے کٹے
فکرِ فردا ہے نہ کچھ ہمکو خیالِ دوش ہے

رازِ ہست و بود سربازِ محبت پر کھلا
طائرِ وہم و خیالِ فلسفی خاموش ہے

وہ میری زینت وہ ویرانہ دل وہ امید
کیوں شبِ وعدہ آگئی شام سے خاموش ہے

انکی خاطر سے اٹھانا ہی پڑی دشمن کی لاش
کل وبالِ جان جو تھا وہ آج بارِ دوش ہے

منزلِ مقصود پر مرکے پہونچے بھی تو کیا
کارواں در کارواں نیا خزاں بر دوش ہے

کروں طے وادیٔ الفت یہ اب طاقت کہاں میری
دلا دے تو نہ منزل پر پہونچکر کارواں میری

ذرا کہنے تو دیں آکر تو بیٹھیں دل ہلا دونگا
گل و بلبل کا یہ قصہ نہیں ہے داستاں میری

تنفر کی کوئی حد ہے کہ رستہ کاٹ جاتے ہو
نظر آتی ہے تم کو دور سے صورت جہاں میری

سبق انکو جوانی نے دیا جب بے حجابی کا
تو خود نوبت بہ نوبت بڑھ چلیں بیباکیاں میری

جوانی اِس دلِ ناعاقبت اندیش کے ہاتھوں
رہی باغِ تمنا میں پرستارِ خزاں میری

نقاب الٹا نہ اے دستِ جنوں رخسارِ جاناں کا
شکایت ہے یہ داماں کی اڑا دیں دھجیاں میری

کہیں جذبات بھی رکتے ہیں بیجا قید و بندش سے
بہت کچھ ہمت افزائے جنوں ہیں بیڑیاں میری

جذبہ ایثار کا اس درجہ تھا پروانے میں
حاصلِ عشق نظر آگیا مٹ جانے میں

پاسِ رنداں بلاکش کے وہ راہی کیا تھا
محتسب کیلئے کیا چھوڑتے میخانے میں

یہ رقابت یہ جلاپا یہ بناوٹ یہ حسد
بات اپنوں سی کہاں آئیگی بیگانے میں

کیا عجب ہے کہ حسینوں کو بھی اپنا کرلے
ہوش اتنا تو ابھی ہے ترے دیوانے میں

حسن اس رنگ میں عریاں ہو کہ اے زینتِ حسن
کچھ تڑپنے کی بھی صورت رہے تڑپانے میں

دیر بھی کتنی فقط آنکھ جھپکنے کی ہے دیر
موت آنے میں و آں نہیں شباب آنے میں

دخترِ رز جب سے ہوئی انکے حرم میں داخل
شیخ جی جم کے نہ بیٹھے کبھی مردانے میں

تصویر تیری جب سے عاشق کی نظر میں ہے
کچھ درد سا دل میں ہے کچھ ٹیس جگر میں ہے

ماتھے کا رگڑنا ہے سجدہ یہ نہیں زاہد
حورانِ بہشتی کا سودا ترے سر میں ہے

موجوں کی تھپیڑوں کا دریا کے طلاطم کا
سامان مہیا سب اس نور قمر میں ہے

جاتے ہی تیرے حسرت ہر شئے سے برستی ہے
گویا کہ اب اک ہو کا عالم ہی کہ گھر میں ہے

مرتے کو جلاتی ہے جیتے کو مٹاتی ہے
اللہ رے کیا قدرت اس ترچھی نظر میں ہے

اربابِ بصیرت کو دیوانہ بنا ڈالے
وہ دل میں حرارت ہے وہ سوز جگر میں ہے

یک لخت مٹادے گا سب وصل کی لذت کو
وہ خدشہ جو پوشیدہ ابھی خوفِ سحر میں ہے

خلوت نہ سہی لیکن رقصاں تو ہیں ہم دونوں
اک ہاتھ ہے شانے پر اک ہاتھ کمر میں ہے

زلف و رخ جاناں میں آئی جو نظر ہم کو
وہ کیفیت دلکش کب شام و سحر میں ہے

اپنے کیا کہتے ہیں غیر آنکے کیا کہتے ہیں
آپکو کہتے جو کانوں سے سنا کہتے ہیں

ہے بقا وہ جو تری راہ میں سر دیکے ملے
خضر کیوں موت نہ آنیکو بقا کہتے ہیں

مرتبہ رندوں میں ہے ساقی کوثر کے طفیل
جب میں پیتا ہوں تو سب صلّ علےٰ کہتے ہیں

آج تو جا کے اسیرانِ قفس سے کہدے
پھول جو کچھ ترے کانوں میں صبا کہتے ہیں

لوگ جو دردِ محبت سے ذرا واقف ہیں
درد کو لاکھ دواؤں کی دوا کہتے ہیں

حسن ڈھلتا ہے تو تم حسن کا صدقہ دیدو
اکثر اس طور پہ ٹلتی ہے بلا کہتے ہیں

دیکھ اعجاز یہ اونیٰ سا تبوں کا کہ انھیں | جو خدا کہہ نہ سکے شانِ خدا کہتے ہیں

آدمی حضرت واعظ بہت اچھے ہیں مگر
بات جو کہتے ہیں وہ بے سروپا کہتے ہیں

کبھو کبھو میرے نالے اثر نہیں رکھتے | کہاں ہیں آپ کچھ اپنی خبر نہیں کہتے
جھکے جو غیر کے در پر وہ سر نہیں رکھتے | پڑے جو غیر پہ ایسی نظر نہیں کہتے
ملے جب اُن سے تو کہا کہ زلف غائب ہے | سنا یہ کرتے تھے ہوش کمر نہیں کہتے
ترے وہ ڈھونڈنے والے وہ جستجو والے | ترے کرم سے اب اپنی خبر نہیں کہتے
دلِ حزیں کو ادھر صبر و ضبط کی تعلیم | اُدھر یہ زعم کہ نالے اثر نہیں کہتے
نگاہ ناز کے زخموں کا یہ قرینہ ہے | رفو کی تاب وہ اے چارہ گر نہیں کہتے
وہ تم کہ ایک نہیں سو دلوں کے مالک ہو | وہ ہم کہ دل نہیں رکھتے جگر نہیں کہتے

سزا جزا کا کبھی ایک روز آنیوالا ہے
پسِ فنا بھی وہ دو پھول میری میّت پر

خیال اتنا بھی یار و بشر نہیں رکھتے
نہیں کہ رکھ نہیں سکتے مگر نہیں رکھتے

ہیں اپنے دورِ گزشتہ کے قصّہ گو شمشاد
زبان اگرچہ یہ دیوار و در نہیں رکھتے